تعمیرِ ملّت

محمد شریف چشتی
ایم، اے۔ ایل ایل بی۔ (علیگ)

ناشر

کتاب خانہ پنجاب لاہور

بار اوّل　　جون سنہ ۴۵ء　　قیمت عہ

۷۸۶

اُن گمنامی مرتبت فرزندان و دختران ملّت
کے نام جن کے دلوں میں اسلام کو غالب و سربلند
دیکھنے کی تمنّا تڑپ رہی ہے، اور جن کے عزم و عمل سے
ملّت اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ اور عالم انسانی کی تقدیر
وابستہ ہے۔

ایم ثہیر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور سے چھپوا کر کتاب خانہ پنجاب لاہور سے شائع کی ۔

ناشر

کتاب خانہ پنجاب لاہور

بار اوّل | جون ۴۵ء | قیمت عہ

⁂

پیش لفظ

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانِ دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!!

بقائے اصلح Survival of the Fittest کے ارتقائی نظریہ حیات میں کچھ صداقت ضرور ہے اور جہاں تک افراد اور قوموں کی زندگی میں اس اصول کی کارفرمائی کا تعلق ہے یہ صداقت اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ کے الٰہی سانچے میں ڈھل کر متعیّن ہوتی ہے۔ کوئی فرد یا قوم اُس وقت تک عزت و آبرو کی زندگی کی، جو دراصل زندگی کہلانے کی مستحق ہے، حقدار نہیں ہو سکتی جب تک اس کی ایک ایک سانس اس معیار

پر پوری نہیں اترتی۔ ایک خاص فرد یا قوم کس حد تک بلند یا کس حد تک پست ہے؟ اس کا مقیاس یہ ہے کہ وہ بدنی نشو و نما۔ ذہنی اور روحانی تربیت۔ جذبات و حسیات۔ امیال و عواطف۔ جبلّی میلانات نسلی و اجتماعی رجحانات۔ ساخت پرداخت مظاہراتی تہذیب و تفنیس وغیرہ کے لحاظ سے کہاں تک فطرت کے اس قانون سے ہم آہنگ ہے؟ کامیاب جہد للحیات اور زندگی کی راہ میں نتیجہ خیز مسابقت کا ضامن یہ کھلا ہوا راز ہے کہ کسی فرد یا قوم میں زندگی کی اعلیٰ صلاحتیں کس حد تک پائی جاتی ہیں۔ اور ان صلاحیتوں کو زندہ رکھنے پنپنے اور ماحول کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کے لئے اس فرد یا قوم میں کس قدر قوت۔ عزم۔ ثبات۔ یقین اور تہوّر موجود ہے۔ تاریخ ارتقائے حیات پر عمومی اور قوموں کے عروج و زوال پر خصوصی نظر ڈال کر دیکھئے تو یہ حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی۔

اقوام عالم میزانِ امتحان میں

موجودہ جنگ اور جنگ سے پیدا ہونے والے نتائج نے دنیا کی ہر قابل ذکر قوم کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ کوئی قوم عزت و آبرو کی زندگی کے واضح تقاضوں سے چشم پوشی اختیار کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ آج ہر قوم عزت سے زندہ رہنے یا حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا چکی ہے اور اس بازی میں اپنا عزیز ترین ساز و سامان اور محبوب ترین سرمایہ قربان کر چکی ہے۔ وسعتِ زمین کے چپے چپے پر آگ اور خون کا ہولناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ زندگی کا ہر ساز توپوں کی گرجتی ہوئی آواز، اور امن و سلامتی کی

ہر تدبیر پھٹتے ہوئے بموں کے شعلوں کی لپیٹ میں کھوئی جا رہی ہے۔ کارزار حیات میں خشک و تر کا ذرہ ذرہ، قطرہ قطرہ جھلسا جا رہا ہے۔ دنیا کی ہر قوم اپنی روایات۔ اپنے حال۔ اپنے مستقبل اور اپنے ناموس کی حفاظت کے لئے لڑ رہی ہے۔ مر رہی ہے اور مر مر کر زندگی پر اپنا حق ثابت کر رہی ہے۔ غرضیکہ ہر قوم کو ایک معرکۂ قیامت درپیش ہے اور وہ اپنی اَصْلَحِیَّتُ کے طفیل باقی رہنے یا غَیْرُ اَصْلَحِیَّتُ کی پاداش میں مٹ جانے کے لئے مجبور ہے!

ملت اسلامیہ کی غفلت

اس محشرستان حوادث میں صرف ملت اسلامیہ ہے جو من حیث المجموعہ آتے ہوئے سیلاب بلا کی بے پناہی کا اندازہ لگانے اور اُن کا مقابلہ کرنے کی تیاریوں سے غافل ہے صورت حالات بالکل ایسی ہے جیسے کسی پر رونق اور گنجان آبادی میں آگ سلگ چکی ہو۔ تند و تیز ہوا چل رہی ہو۔ دھوئیں کے بادل رفتہ رفتہ فضائے بے کراں پر ہر طرف چھلتے جا رہے ہوں۔ ہر لحظہ گمان ہو کہ آگ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل کر سارے ساز و سامان کو جلا کر راکھ کر ڈالیگی سب لوگ اپنے اپنے بچاؤ کی تدبیر میں لگے ہوئے ہوں، لیکن ایک سوختہ بخت گھر ایسا بھی ہو جس کے افراد لمبی تانے سوئے ہوں، بھڑکتے شعلوں۔ چلتے جھکڑوں۔ لوگوں کی چیخ پکار۔ اور جگانے والوں کی آواز کا کوئی اثر نہ ہو۔

ملّت اسلامیہ کی اجتماعی غفلت اور بے حسی اب دراصل غفلت اور بے حسی کے دورسے گزر کر فکری۔ نظری اور وجدانی موت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جس طرح ایک مردہ اپنے ماحول سے بے خبر اور غیر اثر پذیر ہوتا ہے اسی

طرح صدیوں کے فساد تخیل اور اس فساد سے پیدا ہونے والی غلامی اور غلامانہ مجبوری کے طفیل وہ ہر قسم کے خطرات سے آگاہ ہونے کے باوجود ان کے دفعیّہ کے لئے ہاتھ پیر ہلانے پر قادر نہیں اور جس ذلت کی موت کا خطرہ طوفان کی طرح اس کی متاعِ حیات وعزت کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ چکی ہے۔ یہ بے بسی ملّت کے اونچے طبقے سے لے کر نچلے طبقے تک ہر حصّے میں اپنی نرالی اور جداگانہ شان سے جلوہ گر ہے۔ اعلےٰ طبقے میں جو وزارتوں۔ امارتوں۔ عمارتوں۔ جاگیروں۔ مربعوں۔ خطابوں اور طرّوں سے "سرفراز" ہے **اسلام** کی حقیقت بس اتنی رہ گئی ہے کہ عام مسلمانوں سے اسلام کے نام پر ووٹوں کی بھیک مانگ سکے اور حکومت سے "حقوق المسلمین" کے نام پر عہدوں اور ملازمتوں کی گدائی کر سکے تاکہ وہ ان بلند مناصب کے عوض میں اپنے آپ کو اغیار کا اور جن سے ووٹ لے کر کامیاب ہوتا ہے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا غلام رکھ سکے۔ متوسط طبقے کو جو ہر قوم کی ریڑھ کی ہڈی اور جان ہوتا ہے سیاسی اور اقتصادی غلامی نے تباہ و برباد کر ڈالا ہے اور جو کرم خوردہ ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے اس میں بھی شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہیں۔ اس طبقے کے ایک حصّے پر دین و ملّت کی طرف سے عائد ہونے والے فرائض کی طرف سے ایک عام بیگانگی و لاپرواہی Indifference اور بقیہ حصّے پر اسلام سے دوستی نما دشمنی کا خود فریب اور خدا فریب سماں چھایا ہوا ہے۔ ملّت کا یہی طبقہ ہے جس کے عزم و عمل اور صلاحیتوں کی بنیاد پر تعمیرِ ملّت یا تخریبِ ملّت کے لئے کامیاب اقدامات کئے جا سکتے ہیں، لہٰذا

ٹھیک یہی طبقہ ہے جو اپنے بیگانوں کی ہوس رانیوں اور ستم آرائیوں کا تختۂ مشق ہے۔ اس طبقے کی تقدیر اُلٹنے میں مذہبی شعبدہ بازوں، سیاسی مداریوں جماعتی لیڈروں اور اقتصادی قزّاقوں کا یکساں مفاد اور یکساں ہاتھ ہے۔ باقی رہے عوام تو ان کی عام اقتصادی۔ تعلیمی۔ تمدّنی۔ سیاسی اور خصوصاً مذہبی بے مائیگی نے ان کو زندگی کی ہر دوڑ میں پسپاً منسیاً کر کے رکھ دیا ہے!!

اُمّتِ محمّدیہ کا مقام

قرآن کریم نے جو خاطرِ حیات کی طرف سے انسانوں کے لئے آخری اور مکمل ترین ضابطۂ حیات ہے۔ موت و حیات، عزت و ذلت، فلاح و خسران کی راہیں واضح کر کے رکھ دیں ہیں۔ اس کا پیغام جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر واشگاف اور غیر مبہم تھا اسی طرح آج بھی ہر سننے والے کان۔ ہر دیکھنے والی آنکھ۔ ہر سوچنے والے دماغ۔ اور ہر قبول کرنے والے دل اور ہر طبعِ سلیم کے لئے اپنی تمام صداقتوں اور دلکشیوں کے ساتھ زندہ ہے۔ اور آج تہذیب و تمدن اور علم و ہنر کی اجارہ دار قومیں تباہی و بربادی کے جس بھڑکتے ہوئے جہنّم میں گر چکی ہیں اس سے اگر انہیں کوئی گروہ انسانی نجات دلا سکتا ہے تو وہ وہی گروہ ہے جس کو خدا کے آخری پیغام نے خصلتِ اُمّت کے لیے مثل اور قابلِ رشک لقب یاد فرمایا ہے۔ اولادِ آدم کو اس کی موجودہ بے نظیر افراط و تفریط اور ضلالت و گمراہی سے اگر کوئی قوت بچا سکتی ہے تو وہ ملّت ہے جس کو خدا نے اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سپرد کر کے دنیا کی باقی ملتوں اور قوموں کا محتسب اور نگران بنایا ہے!!

اسلام کا تجویز کردہ حصار امن یعنی مرکزیت

اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باشرف فریضہ مسلمان کے سپرد کرتے وقت اس کے لئے ایک حصار امن تجویز کیا تھا تاکہ وہ اس میں داخلی اور خارجی فتنوں سے محفوظ اور مصئون رہ کر جلال و تمکنت کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہو سکے اور اس منزل رفیع کی طرف جادہ پیمائی کر سکے جو روز ازل سے اس کے لئے مقدر ہو چکی تھی وہ حصار امن ہے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ــــــ (ترجمہ) اطاعت کرو اللہ کی ۔ اطاعت کرو رسول کی اور اس حکمران کی جو تم میں سے ہو۔ خدا ۔ رسول اور امیر کی سہ گونہ اطاعت کا نقطۂ ماسکہ رسول اکرم صلعم کی زندگی ہیں اور اس کے بعد ایک مضبوط مرکز تھا ۔ اسلام نے جو دنیا کا سب سے بڑا توحیدی انقلاب اور جو دنیا سے کفر و ایمان اور تقوی و فجور کے امتیازات کے علاوہ ہر امتیاز کو مٹانے کا داعی ہے، اس مرکزیت کو زندۂ جاوید اور ناقابل شکست و ریخت بنانے کے لئے جو عوامل تجویز کئے تھے ان کی ہر تفصیل توحید انگیز اور تفریق سوز ہے ان عوامل پر صدق دلی سے پابند ملت کے لئے دنیا میں ذلیل و منتشر ہو کر رہ جانا طبعی ناممکنات میں سے ہے ۔ مگر جب سے مسلمان نے اپنی مرکزیت کی بیخ و بن کو خود اپنے ہاتھوں اکھاڑ پھینکا ہے ۔ اس مرکزیت کے عطا کرنے والے خدا نے بھی اس قوم کی عظمت و شوکت اور جلال و جبروت کی بنیادوں کو تہس نہس کر ڈالا ہے خدا نے مسلمان کو امامت اقوام کا بلند منصب عطا کرنے وقت صاف صاف الفاظ میں تنبیہہ فرما دی تھی کہ ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم

اُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ہ (قرآن کریم۔ سورۂ حشر۔ آیت نمبر ۱۹) مگر مسلمان نے اپنے ذاتی اور خاندانی مفاد پر اس خدائی فرمان کی اطاعت کو قربان کر ڈالا اور اس نافرمانی کی پاداش میں اس کا یہ حشر ہُوا کہ خدا کی وسیع زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اس پر تنگ اور اپنے تمام ظاہر و پوشیدہ خزانوں کے باوجود اس کے لئے ویرانہ بن کر رہ گئی۔ وہ قومیں جو اس کی بارگاہ جلال پر سجدہ فشانی کو اپنی حیات کا کمال گردانتی تھیں اس پر مسلّط ہوگئیں اور مسلمان کے لئے ان کے چنگل سے نکلنے کی ہر تدبیر بیکار ہو کر رہ گئی۔ ملّت اسلامیہ کی اجتماعی ذلّت و بے دست و پائی کی صورت میں فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ کی عبرتناک تصویر ہماری حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور باوجودیکہ ؎

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی

موت اور زوال کے ظلمت انگیز چکر میں قوم کچھ اس طرح گرفتار رہے کہ کسی کو نہیں سوجھتا کہ یہ بادی و نحوست کس راہ سے آئی۔ بگاڑ کہاں ہے مریض ملّت کے تیماردار مایوسی نا امیدی کے باوجود ہر طرف ٹاملک ٹوئیاں مار رہے ہیں چالاک طبیب اپنے اٹکل پچو ٹوٹکوں کو تیر بہدف نسخے کہہ کہہ کر اپنی اپنی دکان چمکانے اور مخلص مگر احمق تیمارداروں کو دھوکہ دینے میں مصروف ہیں مگر کسی کو نہیں سوجھ رہا کہ مرض کیا ہے اور اس مرض کا علاج کیا ہے۔ کچھ دردمند لوگ جن کی انگلیاں نبضِ ملّت اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہیں کچھ کچھ سمجھ رہے ہیں کہ مرض کی نوعیت کیا ہے اور مریض کو بچانے کی صورت کیا! مگر سچا صورت حال کو قوم

نے کچھ ایسا افسوں پھونک رکھا ہے کہ ملّت مریض کے نادان تیماردار ان کے اشارے پر مرض کو سہل العلاج اور مخلص طبیبوں کی ہر نصیحت اور ہر تجویز کو ہذیان سمجھنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ علامات مرض سے مکمل بیگانگی برتی جا رہی ہے۔ معالجوں کی بتائی ہوئی تشخیص میں سو سو رخنے نکالے جا رہے ہیں مرض کو رفتہ رفتہ بڑھایا جا رہا ہے اور مریض کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے "معصوم" ڈھب اختیار کئے جا رہے ہیں۔

حفاظت دین کی ذمہ داری کا غلط تصوّر

مومنین قانتین کا ایک بڑا حصّہ اس بات پر قانع ہے کہ اسلام تو خدا کی اپنی دولت ہے وہ خود اسکی حفاظت کا وعدہ فرما چکا ہے، ہمیں کیا غم؟ اگر آج مسلمان حکمران نہیں۔ اگر آج اسلام کے گھر میں کفر گھس آیا ہے تو ہمیں اس پر چیں بجبیں ہونے کی کیا ضرورت؟ صحیح مومن تو وہی ہے جو اپنی مرضی کو رضائے الٰہی کے تابع کر دے اور بہر حال الحمدللہ پڑھ کر مطمئن ہو جائے۔ وغیرہ ذالک من شرور انفسنا ومن سیئات عقائدنا۔ اللہ اکبر!! ے

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر!

اگر حقیقت یہی ہوتی جو عام طور پر سمجھی جا رہی ہے تو خدا اپنے پیغام کی حفاظت کے لئے آئت اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ہ اور اسی طرح دیگر مقامات میں اپنے

پیغام کی حفاظت، نفاذ اور ترویج عام کے لئے جان لینے اور جان دینے کی تاکید نہ کرتا۔ خدا کے رسولؐ اور اُس کے قدسی صفات پیرؤوں کو میدان بدر میں تین سو تیرہ ہوتے ہوئے ہر قسم کی بے سروسامانی کے باوجود لشکر طاغوت کے ایک ہزار سے ٹکرانے کی نوبت پیش نہ آتی اور نہ ہی رسولِ کائنات کو اُحد کے میدان میں اپنی پیشانی نورانی لہو لہان اور دندانِ مبارک شہید کرانے کی ضرورت واقع ہوتی۔ یہ تو صحیح ہے کہ خدا اپنے دین کی حفاظت خود کریگا۔ مگر یہ حفاظت اُس قوم کے ذریعے اور اس ملّت کی وساطت سے ہوگی جو اس کو سینے سے لگا کر میدانِ زیست میں آئے گی۔ مسلمانوں نے جب تک پیغام الٰہی کو اپنے سینے سے لگایا خدا کے محبوب بنے رہے۔ ان کی تدبیر تقدیر الٰہی کا آئینہ اور ان کی نیّت مشیّتِ خداوندی کی رازداں رہی اور وہ بارہ برس میں چھتیس ہزار شہر اور قلعے فتح کر کے ۲۵ سال کی قلیل مدت میں معلوم وسعت زمین کے مشرق و مغرب پر ابر رحمت بن کر چھا گئے۔ لیکن جونہی وہ اسلام اور شارع اسلام کے بتائے ہوئے معیار و منہاج حیات سے گرے اُن کا سیاسی تمدنی اور علمی سرمایہ غارت گروں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا یہاں تک آج اُن کی صرف یاد اور وہ بھی بر سبیل عبرت باقی رہ گئی ہے۔ خدا یقیناً اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے۔ مگر اس کی حفاظتِ دین کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ جن تاتاریوں کے ہاتھوں اسلام کے نام نہاد عباسی محافظوں کی دولت تاراج ہوئی تھی، اِنہی کو آگے چل کر جب خدا نے دولتِ اسلام سے مالامال کر دیا تو وہ یورپ کی عیسائی دنیا سے اُٹھنے والے کفر کے طوفانوں کے مقابلے میں

چھ سو سال تک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے رہے۔ ہم اس بات کو نہیں روتے
کہ ہم مٹ گئے تو اسلام کی حفاظت کون کریگا۔ ہمیں تو اس بات کا کھٹکا ہے
کہ اگر ہم نے اسلام کی حفاظت کر کے اپنے آپ کو اسلام کے سایۂ رحمت میں
نہ رکھا تو ہم خود مٹ جائیں گے اور ہمیں خدا کے قہر و عتاب سے دنیا کی کوئی قوت
نہ بچا سکے گی اور انصاف سے کہئے کہ ؎

نہ جب ہم ہی ہوں گے تو کیا رنگِ محفل ؟

آمد مہدی کا تخیل

جس طرح دینِ الٰہی کی حفاظت کے بارے میں مسلمان
کے جمود و تعطل نے اُسے غلط اور گمراہ کن حیلہ
آرائی [illegible] رکھی ہے اسی طرح ایک "مہدی برحق" اور "امام آخر زمان" کی
آمد کے متعلق عجیب و غریب روش نے مسلمان کے قوائے عملیہ، نفسیات اور
صلاحیتوں پر قیامت ڈھا رکھی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اُن کی آمد کے
شدید اور طویل انتظار میں ان کی آمد کی ہر خاموش آہٹ کاروانِ ملّت کے لئے
پیغامِ رحیل اور ذوقِ عمل کے لئے مہمیز ثابت ہوتی مگر آہ! غلامی سے فطرتیں
کچھ اس طرح منقلب ہو کر رہ گئی ہیں کہ مسلمان خدا اور خدا کے عائد کردہ ہر
فرض کو "آنے والے" کے لئے چھوڑ کر خود عمل سے فارغ ہو بیٹھا ہے۔ سمجھ میں
نہیں آتا کہ "مہدی منتظر" مردوں کی بستی میں آکر کیا کریں گے اور پھر معلوم نہیں
کہ جو قوم "آنے والے" کی آمد سے پہلے اپنی سیرت اور کردار سے فَاذْهَبْ
أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ کی روش پر چل
نکلی ہے وہ اُن کی تشریف آوری کے بعد کیا تیر مارے گی؟ "آمد مہدی" کے

متعلق عقیدے نے جو جو ستم ڈھائے ہیں ان کی تفصیل ضروری ہے مگر افسوس ہے کہ کتاب کا پیش لفظ ایسی تفصیلات کے لئے موزوں مقام نہیں۔ لہذا یہاں پر صرف اشارۃً ہی کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔

اسلام جو خدا کا آخری پیغام اور بنی نوع انسان کے لئے آخری اور مکمل ضابطہ حیات ہے دیگر مذاہب عالم کے مقابلے میں اپنی ہر تفصیل اور جہت سے تفوق اور برتری کا دعویدار ہے مگر اسلام کے حاملوں نے اسلام کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو پس پشت ڈال کر جہاں اپنی عظمت اور عدیم المثالی کو خاک میں ملایا ہے وہاں اسلام کی برتری اور تفوق کو بھی اپنے عمل سے ہموار کر ڈالنے کی سعی کی ہے۔ اسلام سے پہلے کے ہر قابل ذکر مذہب مثلاً بدھ مت۔ یہودیت مجوسیت۔ ہندو مت وغیرہ میں "آنے والے" کا تخیل موجود ہے اور جہاں جہاں یہ تخیل موجود ہے وہاں "آنے والے" کی آمد سے زمانے کو اس مذہب کے پیروؤں کی انتہائی ذلت۔ پستی اور بربادی کا زمانہ بتایا جاتا ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ ان کی مبارک آمد ہی سے ذلت عزت میں۔ پستی عروج میں اور بزدلی فوز و فلاح اور کامیابی میں بدلے گی۔ "آنے والا" اگر مٹے ہوئے مذہب کو دوبارہ زندہ اور گری ہوئی قوم کو دوبارہ سربلندی سے ہمکنار کرے گا۔

قبل از اسلام مذاہب میں اس عقیدہ کی تک اور لم تو سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ختم نبوت اور تکمیل دین پر اٹل اور قرآنی ایمان رکھنے والی ملت میں یہ عقیدہ کیونکر پیدا ہو گیا؟ اسلام سے پہلے جتنے مذہب دنیا میں آئے وہ نسلی۔ قومی اور وطنی تھے۔ یعنی وہ اپنے پیغام اور اس

پیغام کی نوعیت و اہمیت کے لحاظ سے زمانی اور مکانی طور پر محدود تھے۔ رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم سے قبل کوئی نبی۔ کوئی رسول اور کوئی اوتار اپنے ساتھ کوئی ایسا ضابطہ نہیں لایا۔ جس کے متعلق اس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ وہ تمام بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے اور ابدالآباد تک کے لئے ہے۔ اس کے برعکس جتنے پیغمبر تشریف لائے وہ جاتے جاتے ایک اور "آنے والے" کی خبر دے جاتے۔ اور اس لئے بجا طور پر کہ ان انبیائے علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری کا مقصد تکمیل دین نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک خاص نسل۔ ملک یا قوم کی وقتی اصلاح مقصود ہوتی تھی۔ پھر مسلمانوں سے پہلے کی امتوں نے اکثر اپنے رسولوں کی لائی ہوئی کتابوں میں من مانی تحریفیں کر کے ان پیغاموں کی اصلی روح اور صورت کو مسخ کر ڈالا تھا جس کے نتیجے میں فتنہ و فساد برپا ہوتے اور سلیم طبائع نے محسوس کیا کہ کوئی اور شخصیت آنی چاہیئے جو اس فساد کی اصلاح کرے۔ غرضیکہ قبل از اسلام اقوام میں "آنے والے" کا تخیل اور عقیدہ طبعی امر معلوم ہوتا ہے مگر قرآن کریم نے سرور کائنات صلعم کی شانِ نبوت اور نبوت کے ان پر حتماً اختتام اور اسلام کے بحیثیت دین مکمل اور آخری ہونے کا جس غیر مبہم اور واشگاف طور پر اعلان کیا ہے اس کے پیش نظر" آنے والے کا عقیدہ پورے اسلامی نظام کے خلاف اور منافی نظر آتا ہے۔

اسلام کا آفتاب جہاں تاب کا طلوع تاریخ کی اس منزل پر ہوا جب عالم انسانی اپنے عہد طفولیت سے گزر کر شباب میں داخل ہو چکا تھا۔ جب

ذہن انسانی بلحاظ ارتقا اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں اس میں ایک عالمگیر دین یعنی اجتماعی ضابطہ حیات کو قبول کرنے کی صلاحیت نشوونما پا چکی تھی۔ رسول کائنات علیہ التحیۃ والتسلیم کی بعثت اسوقت ہوئی جب ایک طرف دورِ وحی و الہام Age of Revelation اور دوسری طرف دورِ عقل و بصیرت Era of Reason کے ڈانڈے مل رہے تھے۔ حضور کی تشریف آوری سے دین مکمل ہو گیا۔ جہاں ایک طرف وحی و الہام کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوا وہاں عقل و بصیرت اور وجدان کے دروازے کھل گئے۔ اب، کسی "آنے والے" کی گنجائش ہے، نہ ضرورت! اور نہ ہی قرآن مجید کی کسی آیت سے کسی استدلال کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے اس کے برعکس خدا کا واشگاف اعلان ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ○ (ترجمہ) "آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور (اس ضابطہ حیات کو جسے) اسلام کہتے ہیں) میں نے تمہارے لئے بحیثیت دین پسند کیا ہے۔" پھر اس آقائے گرامی مرتبت کو جس کے ذریعے خدا نے بنی نوع انسان پر اپنی نعمت تمام کی یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (یعنی اے مشرق و مغرب میں بسنے والے) انسانو بلاشبہ میں تم سب کی طرف اور تم سب کے لئے اللہ کا پیغام لایا ہوں۔ پھر رسول اللہ کی شان میں فرمایا گیا۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ○ اور ہم نے آپ کو تمام اولادِ آدم

کے لئے بشارت دینے والا اور تنبیہہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔" یہی نہیں بلکہ اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی کہ حضور اکرمؐ صرف اپنے دور ہی کے تمام انسانوں کے لئے نجات دہندہ بن کر تشریف نہیں لائے بلکہ آپ کے سایۂ رحمت میں ابدالآباد تک کے تمام ادوار اور ان ادوار کے تمام انسان شامل ہیں:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ

(ترجمہ) "اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے $\frac{62}{2-3}$ ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتا اور ان کے دلوں کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت تعلیم فرماتا ہے ورنہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ (اور انہیں کے لئے نہیں جو رسول اکرمؐ کی زندگی میں ان کے مخاطب تھے) بلکہ ان کی طرف بھی جو بعد میں آئے اور آنے والے ہیں"۔ یہ اور دیگر کئی آیاتِ بیّنات سے واضح ہے کہ رسول کریم صلعم کے بعد کسی ظلّی۔ بروزی۔ تشریعی۔ غیر تشریعی صاحب کتاب یا بے کتاب "نبی کی آمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس معراج انسانی کے بعد جو انسان کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی تشریف آوری اور آپ کی ختم نبوت کی صورت میں نصیب ہو چکی ہے اجرائے نبوّت اور رسالت کا عقیدہ۔ اعلان یا خیال اُسی سر اور اُسی دل میں سما سکتا ہے جو ملی ظاہر تقاضے

ذہنی اپنی انتہائی لیستی پر ہے۔ نہیں بلکہ دینی نقطۂ نظر سے یہ خیال اسی شخص کے ذہن پر مستولی ہو سکتا ہے جو فرائض و واجبات ایمان سے ناآشنا اور کفر و الحاد کا نقیب ہے۔ جو ساڑھے تیرہ سو سال سے قائم شدہ وحدت و اجتماعیت انسانی کی اساس کو ختم کر دینے کا داعی ہے۔ یہ حقیقت ان نورانی قلوب پر جو خورشید رسالت سے براہِ راست مستنیر تھے روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسیلمہ کذاب علیہ اللعنۃ نے دعوٰیٔ نبوت کیا تو اُمت کو کسی ذہنی و عقلی الجھن سے دوچار نہیں ہونا پڑا بلکہ اس کے دجل و تلبیس کا قصہ بنوک شمشیر چاک کر کے رکھ دیا گیا، اور اس کے بعد کے مسیلمہ کذابوں نے بھی جن کی تعداد اب تک، کم و بیش تیس ہے جب کبھی دعوٰی نبوت کیا اُمتِ محمدیہ نے، ان کے باطل دعاوی کو کبھی پرکاہ سے زیادہ وقعت نہ دی بلکہ ان بدنما دھبوں کو اپنے دامنِ حیات سے دھو ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹی نبوتیں ملت کے دریائے ابد خرام میں پانی کے بلبلوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں جو دریا کی پر جوش روانی سے پیدا ہوتے اور اپنی موت آپ مرتے رہتے ہیں۔ اِنَّ فِی ذٰالِکَ لَعِبرَۃً لِاُولِی الاَبصار۔

"آنے والے" کا تخیل اور مسلمان

جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا جا چکا ہے مسلمانوں سے پہلے کی اقوام میں ایک "آنے والے" کا عقیدہ ان کے لئے طبعی امر ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ دامنِ گرفتگان ختم المرسلین علیہ التحیۃ والتسلیم میں ایسا عقیدہ کیونکر نبھ سکتا ہے؟ مسلمانوں کے دونوں بڑے فرقے سُنّی اور شیعہ

صدیوں سے "ایک آنے والے" کا انتظار دیکھ رہے ہیں اور حقائق حیات سے متعلق انہوں نے جو روش اختیار کر رکھی ہے، اُس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ جب تک آنے والا آ نہیں جاتا ان کی ذلت و پستی اور بے حسی و جمود کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس صورت حالات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جو بلندی پر فائز تھے اُتنی ہی پستی میں گر چکے ہیں۔ اِس اجتماعی گراوٹ نے ان میں اس قدر احساس کہتری Inferiority Complex پیدا کر دیا ہے کہ ان میں دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانے اور زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا معرکہ مار لینے کا بھی حوصلہ اور یقین باقی نہیں رہا۔ عوام کی رگ و پے میں یہ دل افگن اور مرگ آسا یقین سرایت کر چکا ہے کہ جب تک کوئی "آنے والا" آ کر اُن کو نہ اُٹھائے گا وہ منہ کے بل پستی میں پڑے رہنے پر مجبور ہیں ؎

یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالم پیری!!

شیعہ بھائیوں کے نزدیک "امامت" منصوص ہے اور قریب قریب اتنی ہی اہم جتنی عام مسلمانوں کے نزدیک "نبوّت" بلکہ ان کے ہاں نبوّت و رسالت کی اہمیّت و ماہیّت پر غالباً اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا کہ "امامت" کے تقدّس اور اس کے ساتھ والہانہ عقیدت و وابستگی پر۔ ان کی روایات کے مطابق امامت حضرت علی سے شروع ہوتی ہے اور ان کے بعد ان کی نسل میں متوارث ہو کر بارھویں امام حضرت مہدیؑ پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں میں ہر وقت ایک امام کی موجودگی ضروری ہے

لہذا حضرت مہدی بن عسکری کے متعلق عقیدہ ہے کہ "امام غائب" ہیں جو عراق کے کسی مقام میں پوشیدہ ہیں۔ (امام موصوف کو روپوش ہوئے آج پوری سات صدیاں گذر رہی ہیں)

راقم حروف کا یہ منصب نہیں کہ فرقہ شیعہ کی داخلی تعمیر کو قائم رکھنے والے اعتقادات و روایات کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھے تعجب تو سنیوں پر ہے کہ وہ ختم نبوّت کے بعد "امامت منصوص" یا "امام غائب" جیسے معتقدات کے قائل نہ ہونے کے باوجود شیعہ حضرات ہی کی طرح ایک "آنے والے" کے منتظر ہیں!!

مسئلہ بعثت مجددین

اسی سے ملتا جلتا ایک اور عقیدہ بعثت مجددین سے متعلق ہے جسکی بنیاد ابو داؤد (۲۷۵ھ) کی اس حدیث پر ہے کہ إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا أَمْرَ دِينِهَا (ترجمہ) اللہ تعالیٰ اس اُمّت میں ہر صدی کے شروع میں ایک شخص مبعوث کریگا جو دین (کی روح) کو تازہ کریگا۔ اور اس حدیث کی تائید میں حضرات کرام۔ عمر بن عبد العزیز۔ امام محمد شافعی۔ ابن سریج۔ امام باقلانی۔ امام غزالی۔ امام فخر الدین رازی۔ ابن دقیق العید۔ امام بلقینی سراج الدین جلال الدین سیوطی۔ وغیرہم اور اس کے بعد گیارھویں صدی ہجری میں حضرت مجدد الف ثانی کے اسمائے گرامی کو پیش کیا جاتا ہے۔ علمائے کرام کے ایک ثقہ گروہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث کئی ایک لحاظ سے ضعیف ہے

یہاں حدیث کی صحت و عدم صحت کی بحث اصل موضوع سے دور لے جانی والی ہے ۔ از روئے قرآن جو بات نتھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے وہ یہ ہے کہ اُمّت محمدیہ اللہ کے برگزیدہ بندوں سے کبھی خالی نہیں رہ سکتی ۔ ہر دور میں اور ہر وقت خال خال ایسی برگزیدہ ہستیاں موجود رہی ہیں جن کی فکر و نظر اور سیرت و کردار نے اُمّت کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دیا ہے ۔ اور اس میں کسی خاص صدی یا صدی کے شروع و آخیر کی کوئی تخصیص نہیں ۔

اَلَا اِنَّ اولیاء اللہ لاخوفٌ علیھم وَلَا ھُمْ یحزنون ہ

(ترجمہ) اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے دوست (جو ہر وقت موجود ہیں اور رہیں گے) خوف و ہراس اور حزن سے پاک ہیں چنانچہ جب کبھی اُمّت کسی سیاسی ۔ مذہبی ۔ فکری ۔ یا نظری آشوب سے دوچار ہوئی ایک یا بیک وقت ایک سے زیادہ اللہ کے پاک بندے میدان میں آئے اور انہوں نے اپنی مجاہدانہ کوششوں سے ملّت کے ناموس و آئین کی حفاظت کی ۔ اور دینِ قیّم کی زندگی و درخشانی کا باعث ہوئے ۔ اگر "مہدی منتظر" اور ان کی طرح ہر صدی کے شروع یا آخیر میں ایک مجدّد کی آمد کو "الہامی لوازمات" کے ساتھ مان لیا جائے تو یہ ماننا بھی لازم آتا ہے کہ (نعوذ باللہ) دینِ مبین میں اپنے طور پر زندہ رہنے کی قوت نہیں بلکہ وہ ہر سو سال یا کم و بیش اتنی مدّت کے بعد کسی خارجی سہارے کا محتاج ہو جاتا ہے ۔

ملّت کے حصارِ اجتماعیت میں "آنے والے" کا عقیدہ ہی وہ چور دروازہ ہے جہاں سے تمام خود ساختہ "نبی" اور "مجدّد" آئے اور اُمّت کی یکجہتی اور شرح

اجتماعیت کو ڈس کر چلے گئے۔ اِن جھوٹے "نبیوں" اور مجدّدوں کے باطل دعاوی کے برعکس حضرت عمر بن عبدالعزیز سے لے کر حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تک جتنے مقدّسین اُمّت نے کڑے سے کڑے اور نازک سے نازک وقت میں اُمّت کی دستگیری کی اُنہوں نے کبھی بھی مامور من اللہ ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا اور نہ ہی اپنے نہ ملنے والوں کو کافر کہا۔ افقِ ملّت اور مطلعِ اسلام پر ان درخشندہ آفتابوں کا طلوع اُمّت کی پوشیدہ قوتِ حیات اسکی ضابطہ اسلام اور اسوہ رسول سے پرخلوص وابستگی کا نتیجہ تھا جب تک مسلمانوں کی نظر آفتابِ یثرب کی دکھائی ہوئی منزل پر رہی اُن کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات رہی۔ کائنات کی بلندیاں ان کے سامنے سربسجود رہیں۔ مشرق و مغرب کے تخت و تاج ان کے قدموں میں گرتے رہے۔ زمانے کی ہر عزت اور عروج نے ان کے قدم چومے ــــ اُمّت کے قوام میں یہ خوبی موجود رہی کہ اجتماعی حیات کی ہر وادی اور ہر منزل میں عظیم المرتبت مردانِ کار سامنے آ آ کر عامۃ المسلمین کو مستفیض فرماتے رہے مگر جب سے مسلمانوں نے اجتماعی مقصدِ حیات سے آنکھیں پھیر لی ہیں خدا کے فضل و کرم نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور آج ان کے لئے زندگی کی ہر منزل تاریک ہو کر رہ گئی ہے۔ اُن کی مثال ایسی ہو گئی جیسے تاریک رات میں ساحل سے دور طوفانی سمندر میں ٹوٹی پھوٹی کشتی میں قسمت کا مارا کوئی اپاہج اپنی جان بچانے کے لئے تنکے کے سہارے کے لئے ترس رہا ہو ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ خاتم الرسل کی خاتم اُمم ملّت جو دنیا میں اللہ کے دین کو غالب

کرنے کے لئے مبعوث کی گئی تھی اور جسے اس مقصد عظیم کے لئے تمام ساز و سامان سے مسلح کر دیا گیا تھا ہر کہ و مہ کے دعوائے نبوت و مجددیت کو "نعمت غیر مترقبہ" اور "لطیفہ غیبی" قرار دے کر اس کے پیچھے لگ لے اور ہر "ترکستان" کو کعبہ مقصود قرار دیکر اپنی نماز حیات کا رُخ پھیر دے!

آنے والے پر عقیدہ رکھنے کے بیسیوں خوفناک مضمرات Implications ہیں جن کو اس عقیدے کے جلو میں قبول کئے بغیر چارہ نہیں مثلاً :-

(۱) (نعوذ باللہ) رسول اکرم صلعم کا مشن تکمیل دین پورا نہیں ہوا جس کو پورا کرنے کے لئے کوئی اور آنے والا ہے۔ یہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ...... الخ کا عملی انکار ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متشکل کی ہوئی اجتماعیت ہر وقت بے روح اور بیرونی سہارے کی محتاج ہے۔ (العیاذاً باللہ)

(۳) "آنے والا" چونکہ ضرور آئے گا اور اس کا انکار کفر و الحاد ہے اور چونکہ وہ آئے گا بھی اس وقت جب دین ملت انتہائی ذلت و خواری اور بربادی سے ہمکنار ہوں گے لہذا اگر آج ہم ذلیل اور نکارہ ہو کر رہ گئے ہیں تو اس پر غم کرنے کی ضرورت نہیں "آنے والا" آکر ہمیں سربلند کر دے گا۔

(۴) اس عقیدے کا نفسیاتی نتیجہ بے عملی اور مردہ ضمیری اور دوں نہادی ہے اور یہ وہ عوارض ہیں جن میں عزت و آبرو کی زندگی اور ترفع کے لئے کوئی آرزو پرورش نہیں پا سکتی۔ اور نہ ہی آغوش ملت میں

مردانِ کار پرورش پا سکتے ہیں۔

(۵) یہ عقیدہ جھوٹے مدعیان مجددیت و مصلحیت کے لئے ہمیشہ میدان تیار کرتا رہے گا اور ہمیشہ روحانی ڈاکو آ آکر امت کی متاع ایمان پر ڈاکہ ڈالتے اور امت کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرتے رہیں گے۔

فساد تخیل کا علاج

اس فساد تخیل کا ایک اور صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ مسلمان قرآن کریم کو پھر اپنے قلب و ضمیر پہ نازل کریں اور اس کتاب مبین سے اکتساب نور کر کے وہ نظام ملت از سرِ نو تعمیر کرنے کی صدقدلانہ سعی کریں جو ہماری اپنی غفلت اور اجانب کی دسیسہ کاریوں سے تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ اس نظام کا سنگ بنیاد ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ یعنی مشرق و مغرب اور انفس آفاق کے معبودانِ باطل کی غیر فطری بندگی کی زنجیریں توڑ کر اللہ کی الوہیت اور محمد (فداہ روحی) کی حیثیت و ماہیت پیغمبری پر ایمان لائیں لیکن لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا صرف زبانی ورد اور اقرار۔ اس وقت تک عنداللہ۔ عندالرسول اور عندالعقل قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جب تک ہر فرد صدق دل سے اپنے ایمان اور عمل یعنی اپنی حیات کی ہر سانس کو اس قالب میں ڈھال دینے کا عزم صمیم نہ کرے جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ کا انفرادی اور اجتماعی منتہا ہے یہی عزم۔ یہی تڑپ اور یہی خلوص ہے جس کے افراد میں پیدا ہو جانے کے بعد اجتماعی نقطۂ نظر اذہان میں پیدا اور قلوب

میں راسخ ہوگا۔ بحث و نظر کا یہ نقطہ ہمیں اس مقام پر لے آتا ہے جہاں انفرادی اصلاح کا مسئلہ اپنی پوری شدت اور اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ ساری مصیبتوں کی سرچشمہ یہی جگہ خراش حقیقت ہے کہ اُمت کا شیرازہ منتشر ہوجانے کے بعد افراد کی سیرتیں تاریک ہو چکی ہیں اور ساری مصیبتوں کا حل بھی یہی راز ہے کہ افراد کی سیرت کو از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ ان حالات میں کہ مسلمانوں کی والی وارث کوئی مرکزیت نہیں وہ افراد جن کے قلب و نظر پر ملت کا مبداء و مآل بے حجاب ہے پہلے اپنی سیرت و کردار پر نظر ڈال کر درست کریں پھر اپنی بساط اور ہمت کے مطابق اپنے اپنے حلقہ اثر میں افراد کو درست کرنے کی سعی کریں۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ ماحول پیدا ہو جائے گا جس میں اجتماعیت و مرکزیت کی نمود ہو سکے۔ اگر ہماری مساعی حیات اس ڈھب پر اور اس رُخ کی نہیں تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری زندگی یکسر غیر اسلامی ہے۔ بکھرا ہوا اور منفرد زہد و تقدس ہماری نجات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ خاتم الرُسل کی خاتم المرسلین۔ قرآن کا خاتم الکتب اور ملت اسلامیہ کے خاتم الامم ہونے کا مقصود اولین یہ ہے کہ پہلے ان حقائق پر ایمان لانے والے ایک نقطے اور ایک مرکز پر مجتمع ہوں اور پھر ان کی سعی و جہد سے تمام اولاد آدم ایک شیرازے میں منسلک ہو۔ یہی وہ منزل ہے جس کی طرف ساری اولاد آدم گامزن ہے مگر مجتمع اور فانی نہ ہونے کی وجہ سے بھٹک رہی ہے جب تک جمعیت وجود میں نہیں آتی اس وقت تک مسلمان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ بھی کسی قوم یا

ملت کا فرد ہے۔ اس کی حیثیت ایک بھٹکے ہوئے راہی سے زیادہ نہیں جو اپنی ہر کوشش اور کاوش کے باوجود منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ
باہزاراں چشم بودن یک نگاہ
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو
یعنی از تعمیر مرکز زندہ شو

اللہ تعالےٰ نے ترک قرآن کی سزا دنیا میں ذلت و مسکنت اور آخرت میں عذاب الیم رکھی ہے:-

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ وَكَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۝

پ ۱۶ - سورہ طٰہٰ ۲۰ ع ۷ ۱۲۴ - ۱۲۷

ترجمہ :- "اور جو میری نصیحت (قرآن) سے منہ پھیریگا اسکی زندگی تنگ ہوجائے گی اور قیامت کو ہم اُسے اندھا کرکے اُٹھائیں گے۔ وہ کہے گا میرے پروردگار مجھے اندھا کرکے کیوں اُٹھایا میں تو اچھا بھلا دیکھتا بھالتا تھا خدا فرمائے گا ایسا ہی چاہئے تھا۔ تیرے پاس میری آیتیں آئیں تو تو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج ہم بھی تجھے بھلا دیں گے۔ اور جو شخص حد سے

نکل جائے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لائے ہم اس کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر تک رہنے والا ہے۔"

یہ آیات بینات اپنی تفسیر آپ کر رہی ہیں۔ اور قرآن کے پیغام سے منہ موڑنے والے ہر فرد اور ہر ملت کے لئے آئینہ ہیں جس میں اُسکے خد و خال صاف جھلک رہے ہیں۔ مسلمان کی موجودہ ذلّت و نکبت ادبار و پستی اور بدبختی و نامرادی کے اسباب کی تلاش میں دور جانا اور فلسفیانہ وجوہ تلاش کرنا بے سود ہے!!

حکمی اور حتمی علاج

اس خوفناک اور لرزہ انگیز صورت حالات کا علاج یہ ہے کہ مسلمان پھر قرآن کریم کو سینے سے لگائیں۔ یہی وہ سہارا ہے جو انہیں پارہ پارہ ہو کر ذلّت و بربادی کے جہنم میں گرنے سے بچا سکتا ہے:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔ پ۴ سورۃ آل عمران ع۱۱ آیت ۱۰۳۔ خدا کی رسّی (قرآن حکیم) کو مضبوطی سے پکڑو (یعنی نظری و عملی ہر دو لحاظ سے اس کے تابع ہو جاؤ اور مل جل کر کام کرو) بکھرے نہ رہو۔"

مسلمان جب قرآن کا سہارا لے گا تو کیا ہوگا:۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا

۱۷۵/۴ ترجمہ:۔ پس جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا

اُن کو وہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور اپنی طرف پہنچنے کا سیدھا راستہ دکھلائے گا۔

اور یہی وہ راستہ ہے جو سلامتی کی راہ اور ظلمتوں سے نجات دلا کر نورانی فضاؤں میں داخل کرنے والا ہے:۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؀ ۵ آیت ۱۵-۱۶

ترجمہ :۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشن اور واضح کتاب آچکی ہے۔ اللہ اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں پہ جو اس کی خوشنودیوں کے تابع ہوں سلامتی کی راہ کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے انہیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا اور کامیابی کی راہ پہ لگاتا ہے۔ کامیابی کی یہ راہ ہے ایمان اور عمل صالح اور اس راہ کی منزل ہے استخلاف فی الارض یعنی اللہ کی حکومت اور بادشاہت کا قیام۔ اس کا مقصد ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ عظیم الشان مقصد وہ ملت سرانجام دے سکتی ہے جس کو خدا نے امر بالمعروف اور ناہی عن المنکر یعنی دنیا کی تمام قوموں کا محتسب اور نگران بنا کر بھیجا ہے۔ نیکی کو نافذ کرنا اور بدی کو بیخ و بن سے اکھاڑنا مسلمان کا اجتماعی فریضہ حیات ہے اور یہ اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک مسلمان اطاعت اللہ والرسول پر

قائم نہ ہو۔ اور یہ جبھی ممکن ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والا ایک مضبوط مرکز ہو۔ یہی مرکز ہے جو افراد کا باہم شیرازہ باندھ کر انہیں اُمّت سے اور اُمّت کو خدا و رسول سے ملاتے رکھے گا۔ اس مرکز کو پیدا کرنے کی تڑپ انفرادی اصلاح و تربیت سے خود قوم کے اندر پیدا ہو گی کہیں باہر سے نہیں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اسلام جیسا پہلا اور آخری انقلاب برپا کرنے کے لئے خود انسانوں ہی میں سے "ایک انسان" کو اٹھایا۔ آج اُمّت مرحوم کی حالت بلاشبہ ناگفتہ بہ ہے۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں کہ مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے "ایک آنے والے" کی راہ دیکھتے دیکھتے نقمۂ اجل ہو جائے۔ جس آخری آنیوالے کا دنیا کو انتظار تھا ساڑھے تیرہ سو سال ہوئے آچکا اور پیغام حیات جاویداں لا چکا ہے۔ اب اگر اُمّت کو دوبارہ زندہ ہو کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل ہونا ہے تو اس پیغام کو پھر باندازِ کہن سینوں میں اتار کر۔ اگر کوئی "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے اصول پر اُمّت کی چارہ سازی کے لئے آنے والا ہی ہے تو وہ چھاتا بردار فوج کے سپاہی کی طرح اُوپر سے نازل نہیں ہوگا بلکہ کوئی فردِ اُمّت ہی ہوگا۔ اُس فرد کو پیدا کرنا جو اس میں مرکزیت، وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار پیدا کر دے خود اُمّت کا کام ہے۔ اور ایسا فرد ہی اپنے زمانے کا مہدیٔ برحق ہے۔ ؎

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھکو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

لیکن!

فتنۂ ملّت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے (اقبال رح)

مگر اس کا کیا علاج کہ ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدّت گفتار ہے نے لذّت کردار
دنیا کو ہے اُس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار! (اقبال رح)

کتاب تعمیر ملّت اس وقت جو مختصر سی کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا پیغام ایک درد مند دل کی پکار ہے اور بس! مصنّف کا اٹل یقین ہے کہ انفرادی اصلاح و تہذیب کے بغیر کوئی ملّت آرا تنظیم اور کوئی قلوب گیر اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اصلاحِ افراد ہی وہ عظیم الشان اقدام ہے جو مآل کار اُمّت کی ہمہ گیر تعمیر پہ منتج ہوگا اور وہ ہیئت اجتماعیۂ اسلامیہ تعمیر ہو گی جس کے عزم و عمل میں خدا کا جلال اور جمال جھلک سکے۔ عام افراد کی اس اصلاح کے لئے بہترین آغاز مسجدوں سے اور خواص کی تہذیب و تنفیس کے لئے کامیاب ترین اقدام تعلیمی اداروں کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی توضیح کے لئے کتاب کو چار حصوں یا ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اسلامی اصول و مبادیات سے متعلق توضیحی اشارات دے کہ یہ ثابت

کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے آخری توحیدی انقلاب ہے جس کی غایت اولے ایک عالمگیر اجتماعی ہیئت کی تخلیق و تعمیر ہے۔ دوسرے باب میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ یہ ہیئت کیونکر تعمیر ہوتی ہے۔ تیسرے باب میں یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ اس ہیئت کی روح رواں "اطاعت" ہے "اطاعت" کی بحث میں قرآنی نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں ذرا تفصیلاً بیان کیا گیا ہے کہ یہ روح بحالات موجودہ کیونکر پیدا کی اور زندہ رکھی جا سکتی ہے۔

مصنّف نے کوئی بات کسی زعمِ علم و فضل، کسی داعیۂ تقدّس و طہارت کے دعویٰ سیادت و قیادت کی سفارش پر یا کسی نوع کی طنز و تعریض اور بحث و جدال کے خیال سے نہیں کہی۔ بحیثیت ایک مخلص فرد ملّت کے جو کچھ محسوس کیا گیا ہے اس کو اپنے ٹوٹے پھوٹے مگر بے تکلّف الفاظ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اور محض اس خیال سے کہ ہر فرد ملّت پر اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اصلاحِ احوال کی سعی فرض ہے۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے مجاہدین کی جہادی کوششیں جلیل القدر زعما کی جاں گسل کاوشیں عظیم المرتبت مفکرین کی تدبیریں ایک صدی کی طویل مدّت میں ملت کو خواب مرگ سے نہ جگا سکیں وہاں مصنف کی ہیچ میرز سعی کس گنتی و شمار میں ہے!

اس طوفانِ اضطراب میں جو مسلمانوں کو ہر جگہ درپیش ہے بیسیوں جماعتیں ہیں جو اصلاحِ احوال کے لئے پیچ و تاب کھا رہی ہیں اور ہزاروں افراد ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر سیماب وار تڑپ رہے ہیں مگر کوتاہی ہے تو یہ کہ ان بمنزلہ پرو بال

ہیں کوئی رشتہ اشتراک نہیں جو انہیں ملا کر ملت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہمہ گیر لہر دوڑا سکے۔ کتاب کا روئے سخن انہی افراد اور جماعتوں کی طرف ہے جو بے غرض اور بے لوث درد و کرب کی لذت سے آشنا اور ملت کے لئے کچھ کرنے کی تڑپ رکھتی ہیں۔ اگر اس کتاب کی گذارشات ان کے نزدیک قابل اعتنا ٹھہریں اور اجتماعی طور پر کوئی اقدام سوچنے کی تڑپ دلوں میں پیدا ہو جائے تو اس تصنیف کا مقصد حل ہو جائے گا ورنہ:-

"کس نشنود یا نشنود من ہائے و ہوئے می کنم!"

کھاریاں (ضلع گجرات۔ پنجاب)
مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۴۵ء

محمد شریف چشتی

بابِ اوّل

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا خوارند و زارند
ندا آمد، نمی دانی کہ ایں قوم
دِلے دارند و محبوبے ندارند

(افتتاحی اشارات)

قانونِ فطرت

خورشید جہاں تاب طلوع ہوتا ہے۔ اپنے جلو میں نور و حرارت۔ زندگی اور تازگی کا جال تو ازمہنگامہ لئے ذرّے ذرّے کو جگاتا۔ قطرے قطرے کو گرماتا نصف النّہار تک پہنچتا ہے۔ یہاں سے ڈھلنا شروع ہوتا ہے۔ ڈھلتے ڈھلتے سرِ شام اپنی منزل پر پہنچتا ہے اور شفق کی ردائے احمریں اوڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دن کی روشنی شام کے جھٹپٹے میں اور جھٹپٹا تاریکی میں بدلتا جاتا ہے۔ دن کے ہنگامے سرد پڑ جاتے ہیں۔ رات کی خاموش ظلمتیں چھا جاتی ہیں۔ ہر چیز کو گویا نیند سی آجاتی ہے۔ ہر روز اور ہر وقت کسی نہ کسی نقطۂ ارض پر یہی ہوتا رہتا ہے۔ تخلیقِ روزگار کی صبحِ اوّلیں سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور شامِ ابد کی آخری حدود تک یہی ہوتا رہیگا۔

ایک سورج پر ہی کیا موقوف ہے۔ جیسے جیسے نظامِ قدرت پر غور و فکر کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا یہ حقیقت واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائیگی کہ کارگہِ ہستی کی کوئی شئے ایسی نہیں جو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کر رہی۔ ثوابت و ستیارے آبشار و کوہسار و دشت

دریا۔ بحر و بر۔ ہوا و فضا۔ کڑکتی بجلیاں۔ گرجتے بادل۔ چرند۔ پرند۔ غرضیکہ کوئی ممکن الخیال مشہود اور غیر مشہود چیز ایسی نہیں جو ایک عالمگیر ضابطۂ عمل سے الگ پڑی ہے۔ ذرّہ سے لے کر آفتاب تک ہر شئے اپنی اپنی متعین حدود میں باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ ہر چیز ایک آئینِ محکم کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ یہی وہ عالمگیر ضابطہ ہے جسے زیادہ مروّج زبان میں قانونِ فطرت کہتے ہیں۔ اس قانون کا امتیازی خصوصی یہ ہے کہ اس میں ردّ و بدل اور ترمیم تنسیخ نہیں ہوتی۔ یہ کبھی نہیں ہُوا کہ سورج مشرق کو چھوڑ کر مغرب سے طلوع ہو دریا نشیب سے مڑ کر فراز کی طرف بہے۔ اُچھالا ہُوا پتھر قانونِ کششِ زمین Law of Gravitation کے خلاف گرنے کی بجائے معلّق رہے یا شعلہ جلانے کی بجائے برف کا کام دے۔ یہ سب کچھ اس لئے اس طور پر ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیلًا ؎

اللہ کے قانون میں ہوتی نہیں ترمیم!

. . . . . . قانون ہوتا ہی اس لئے ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے ہر قانون کی یہی شان ہے۔ قانونِ فطرت کی برتری اس میں ہے کہ اس کی مخالفت ناممکن ہے۔ لہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الارض وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وکرھا۔ (زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اللہ کی مکمل اطاعت پہ عمل پیرا ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز خواہی نخواہی اس کے آگے جھکی ہوتی ہے)۔

موجودات کی یہ آئین پسندی فطرت کے اعمال **Processes** میں یہ باقاعدگی۔ عناصر میں یہ ہم آہنگی **Harmony** یہ اہتمام اور اس اہتمام میں یہ استمرار و دوام اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ پس پردہ کسی علیم و حکیم صنّاع **Architectonic Intelligence** کا دستِ قدرت ہے جو کائنات کی اِس عظیم الشان مشینری کے ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے پُرزے کو حرکت دے رہا ہے۔ چونکہ ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ فطرت کا ہر عمل کوئی خاص نتیجہ لئے ہوئے ہوتا ہے لہٰذا کائنات کی حرکتِ کُلّی بھی ضرور کوئی مقصد اور نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ہے۔ بیکار نہیں۔ "حکمتِ جدیدہ" ہزار فیصلہ کرے کہ یہ جو کچھ ہے فطرت کی طاقتوں کا لایعنی کھیل **Play of blind Forces of Nature** ہے مگر وہ شئے لطیف جو انسان کو انعامِ خاص کے طور پر ودیعت ہوئی ہے اور وہ ضمیر جس کا پیوند عالمِ لاہوت سے ہے نہ صرف یہ کہ اِس فیصلہ پر مطمئن نہیں بلکہ اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ عصرِ رواں کے مادی فلسفہ اور سائنس کی ہزار در ہزار اُلجھنوں اور تاریک حجابوں کو چاک کرکے یہ درخشندہ اور تابناک حقیقت خود بخود نگہِ انسانی کے سامنے آجاتی ہے کہ صانعِ ازل کی یہ عظیم الشّان صنّاعی بیکار نہیں۔ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ؕ کائنات کی یہی بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم میں بار بار مختلف پیرایوں میں توجّہ دلائی گئی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۳/۱۹۰

"تحقیق کہ زمین و آسمان کی پیدائش میں۔ رات اور دن کے اختلاف میں ارباب دانش کے لئے کھلی کھلی نشانیاں ہیں"۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔

"کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ رات کو دن میں چھپاتا ہے اور دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ اور تم (بھی) جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے"۔

یہ اور اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں جن میں مختلف نظائر و بصائر سے سمجھایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک مقصد خاص کے لئے کام کر رہی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق و تحریک بھی کسی مقصد کے لئے ہے۔ سارا عالم اسی مقصد کی طرف مصروف خرام ہے۔ جب حقیقت یہی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ انسان جس کے لئے ساری کائنات وجود میں آئی ہے بے مقصد و مدعا پیدا کر دیا گیا ہو۔ جب ایک حقیر ذرہ اور بے مایہ قطرہ بھی باطل یعنی بے کار نہیں تو یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ انسان جس کے سر پر تاجِ تکریم رکھا گیا اور جس کو بحر و بر پر اختیار دیا گیا قرآن مجید

جس کو فرشتوں سے بھی زیادہ صلاحیتیں دی گئیں (۲/۴۲) کسی مقصد کا پابند نہ ہو؟ صحیفۂ فطرت کا ورق ورق اسی لئے انسان کے سامنے کھول کر رکھدیا گیا ہے کہ وہ عقلِ خداداد سے کام لے کر ایک نتیجہ اخذ کر سکے۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے فلسفہ صدیوں سر پٹکتا رہا۔ مگر سوال جوں کا توں رہا ؎

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمّا را

۲۔ خلافتِ الٰہی

جہاں علم و حکمت بے بس ہو کر سپر ڈال دیتے ہیں وہاں وحی والہام بطور ایک لطیفۂ غیبی اور فضلِ ربانی کے عین مجبوری اور درماندگی میں انسان کی دستگیری کر کے اُسے اس راہ پر ڈالتے ہیں جس پر چل کر اس کو اپنی منزلِ مقصود کا نشان صاف نظر آنے لگتا ہے۔ گمانوں کے لشکر یقین کے ثبات سے شکست کھا جاتے ہیں۔

مذہب، ایک سچّا اور الہامی مذہب ہی ہے جو انسان کو ایک بلند اور شریفانہ نصب العین دے کر پستی میں گرنے سے روکتا ہے۔ صرف الٰہی لطف و کرم کی تجلّی ہے جو نگاہ کو زندانِ آب و گل سے رہا کر کے ثریّا تک پہنچاتی ہے۔ مشاہدہ اور مشاہدات پر مبنی علوم کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور اس محدود دائرے میں بھی بلیشمار پہنائیاں ایسی ہیں جو شرمندۂ خبر و نظر نہیں ہو سکیں۔ بقول مستشرف فلبل سے

در جہانِ کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست؟
کشتیِ ادراک را ساحل کجاست؟

عقل بے چاری تو آج تک یہی طے نہ کر سکی کہ روح ہے یا نہیں۔ مادّہ حقیقت ہے یا سراب۔ روح مادّہ سے ہے یا مادّہ روح سے وغیرہ وغیرہ باقی باتیں تو بہت اونچی ہیں۔ یہ صرف خطاب الٰہی ہے جو حقیقت کی تجلّیوں نگرِ انسانی پر بے حجاب کرتا ہے۔ یہ وحیِ آسمانی ہے جس نے اعلان کیا کہ انسان کائنات کی ہر چیز سے بلند و برتر ہے۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ صحرا دریا ہر شئے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق چیز انسان کے لئے ہے۔ مگر وہ خود صرف خدا کے لئے ہے۔ انسان خدا کے بعد سب سے بڑی قوت ہے۔ انسان اگر اپنے مرتبہ اور عظمت کے لحاظ سے سر جھکا سکتا ہے تو صرف خالقِ کائنات کے آگے۔ جو انسان اس کے علاوہ اپنے برابر یا کم تر قوت کے آگے جھکتا ہے وہ انسانیت کے درجہ سے گر کر صرف ایک چیز A thing رہ جاتا ہے۔ اور چونکہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ مفوّضہ فرائض کی تعمیل کر کے اپنی صحیح شان برقرار رکھ رہی ہے۔ جب انسان اپنے مرتبہ سے گر جاتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں Mere Nothing رہ جاتا ہے۔ احسن التقویم ہو کر جب وہ اپنے مقام سے لڑھکتا ہے تو بغیر کسی درمیانی درجہ میں ٹھہرے ہوئے اسفل السافلین کے ظلمت ناک گڑھے میں جا پہنچتا

ہے! انسانیت کی حدود سے خارج ہوکر حیوانات نباتات اور جمادات سے بھی پست ہوجاتا ہے۔

انسان اور دیگر حیوانوں میں حیوانیت مشترک ہے۔ اُس کا شرف خصوصی اور امتیاز Differentia وہ عقل اور بصیرت ہے جو اُس کو ہر چیز سے بلند لے جاتی ہے۔ اتنا بلند کہ مہر و ماہ و مشتری کو بھی ہم عنان سمجھنا اُس کے لئے ننگ و عار ہوجاتا ہے۔ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ انسان خدا کے آگے جُھک کر کائنات کو اپنے آگے جھکائے رکھے۔ خدا کے آگے جُھکنا اور کائنات کو جُھکائے رکھنا یہی دو پہلو ہیں جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتے ہیں۔ صرف ایک خدا کی بندگی اور روئے زمین کی حکومت دونوں چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ ایک کا تصوّر دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔ کسی اور طرح سوچنا اپنے تفضّل، اپنی خودی اور اپنی عظمت کو خاک میں ملانا ہے۔ یہی چیز کفر ہے۔ اسی کا نام معصیّت ہے۔ اور اسی کو غلامی کہتے ہیں! ایک خدا کی بندگی کا دعوےٰ اور محکومی۔ کئی خداؤں کی پوجا اور آزادی ضدّین ہیں۔ جن کو آپس میں جمع نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اللہ کے آگے جُھکنے والا ہی آزاد ہے اور آزاد ہی ایک اللہ کے آگے جُھک سکتا ہے۔ اِس اجمال کی تفصیل اسے

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے!

مختصراً یوں سمجھئے کہ جو ایک خدا کی خدائی پر ایمان لائے گا وہ صرف اُسی کے قانون کو واجب الاطاعت سمجھ کر اُس کے قانون کو اپنی زندگی اور اپنے ماحول کی حیات میں جاری وساری کرنے کی سعی کرے گا۔ اور چونکہ اس قانون

کی مخالفت ناممکن ہے اس قانون کو نافذ کرنے والے کا عزم و تہوّر بھی بے پناہ ہو جائے گا۔ جب وہ وسائنیرِ جہاں پر اللہ کی حکومت قائم کرے گا تو خدا کا وائسرائے بھی وہی نامزد ہو گا۔ کائنات کی ساری قوتیں اسی لئے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری پر مامور و مجبور کر دی گئی ہیں کہ وہ وسعتِ شش جہات میں خدا کی نیابت کر کے جہانِ ناتمام کی تکمیل کر سکے خلافتِ الٰہی کا قیام ہی انسان کی منزل ہے۔ اس منزل کا نشان مذہب نے ہی بتایا۔ یہی منزل ہے جس کی طرف پُرخلوص قدم اُٹھا کر یہ اپنے اندر ملکوتی جوہر پیدا کرتا ہے، وہ جوہر جن کے طفیل یہ خدا کا شاہکار ہے۔

۲۔ ضرورتِ وحی

بہر حال اور بایں ہمہ عظمتِ شان، انسان حیوانِ ناطق ہے۔ حیوانیت اس کی انسانیت سے الگ کر دی جائے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ لیکن اگر یہی حیوانیت اپنی حدود سے بڑھ کر انسانیت پر قابو پالے تو نتیجہ درندگی، بہیمیت اور سفلہ پن ہوتا ہے۔ انسان اپنی صحیح راہ سے بھٹک جاتا اور اصل مقام سے گر جاتا ہے۔ یہ وحیٔ الٰہی پر تو ہے جو انسانی جوہر کی تربیت کر کے حیوانیت کو اُس کی جائز حدود میں رکھتا ہے۔ جب انسان اس پر تو سے منوّر ہو جاتا ہے تو یہ پیکرِ خاکی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اگر فرشتے بھی اس کو سجدہ نہ کریں تو ابدالآباد تک راندۂ درگاہ اور مردود و فستہ رہ جائیں!

. مذہب اور وحی کا مشن صرف افراد کی صلاحیتوں کی تعمیر و تربیت اور تزکیۂ نفس ضرور ہے۔ مگر اس سے بھی بلند اور بالاتر ایک اور مدّعا ہے۔ ہم روزمرّہ دیکھتے ہیں کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی ایک واضح لائحہ عمل اور ایک خاص پروگرام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کو قیام خلافتِ الٰہی ایسا گراں بار فرض تفویض کر دیا گیا ہو اور اس کو بجالانے کا طریقہ نہ بتایا گیا ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ظلوم اور جہول انسان کے کاندھوں پہ اتنا بڑا بوجھ رکھ دیا گیا ہو اور اس کو اٹھا کر چلنے کا گُر نہ سمجھایا گیا ہو۔ یہ محال عقلی ہے کہ اس بارِ عظیم کے حامل کی راہ نما کوئی آواز نہ ہو۔ یہ آوازِ الہام ہے جو کاروانِ آدم کے لئے بانگِ درا کا حکم رکھتی ہے۔ راہرو جادہ ہستی کے لئے ضروری تھا کہ سفر کا پہلا قدم اٹھتے ہی منزل کا پتہ دینے والی تجلّی بھی ساتھ ساتھ رہے۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔

ایسا کوئی قریہ نہیں جس میں ہم نے ڈرانے والا نہیں بھیجا۔ ہر قوم کی طرف کوئی نہ کوئی ہادی بھیجا گیا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۲۵

یقیناً ہم نے اپنے کھلی کھلی ہدایات دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب (خلافتِ الٰہی کے قیام کے لئے ضابطۂ قوانین) اور میزانِ عدل نازل کی۔ تاکہ نوعِ انسانی عدل و توسّط کی راہ پہ چل کر

(منزلِ مقصود تک پہنچ سکے)۔

۴۔ ختمِ نبوّت

غرضیکہ نمودِ آدم سے لے کر طلوعِ اسلام تک ہر دور اور زمانے میں ہر قوم کے لئے رہنما آتے رہے اور انسانی قافلے کے مختلف دستوں کو راہ دکھاتے رہے۔ اس عالمگیر کارواں کے مختلف گروہ خدا کی وسیع زمین کے مختلف اقطاع سے اٹھے۔ مگر بالآخر وہ ایک عظیم الشان شاہراہ پہ ملنے والے تھے۔ جہاں سے سب شانہ بشانہ چلیں اور جہاں سے منزلِ مقصود صاف اور سامنے نظر آئے۔ ان چھوٹے چھوٹے گروہوں کے رہبروں کا کام صرف اتنا تھا کہ اپنے گروہ کو ایک "جرنیلی سڑک" پہ پہنچا دیں۔ جہاں پہنچ کر سب کی راہ ایک ہو جائے۔ سب کی منزل ایک ہو جائے۔ قافلہ سالار ایک ہو جائے چنانچہ جہاں چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں آکر ملتی ہیں۔ اور جہاں بھٹک کر پراگندہ راہوں میں کھو جانے اور منزل سے دور جا پڑنے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے ایک سالارِ اعظم آتا ہے اور درماندہ راہروؤں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ اب میں تم سب کی رہنمائی کے لئے آگیا ہوں انی رسول اللہ الیکم جمیعاً ؕ

تمہارے لئے ساری راہیں جو خطرات سے پُر اور منزل سے دور لے جانے والی ہیں بند کر کے صرف ایک ہی راہ کھلی رکھی گئی ہے۔ ان الدین

عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ جو اِدھر اُدھر بھٹکتا رہے گا منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکے گا۔ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ پھر اہلِ کارواں کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا گیا کہ تمام راستوں کی جانچ پڑتال کے بعد یہی راستہ آخری اور قطعی طور پر مقرر کر دیا گیا ہے اسی میں اطمینان و آرام ہے۔ یہی منزلِ مقصود تک ٹھیک لے جانے والا ہے۔ تمہارے لئے اسی کو پسند کیا گیا ہے:-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۝

آج کے روز تمہارے لئے دین مکمل کر دیا گیا۔ تم پر نعمت تمام کر دی گئی اور تمہارے لئے اسلام بطور ایک ضابطۂ حیات کے چُن لیا گیا۔

۵۔ ایک انقلاب

انبیاء و رُسل کی تعلیم و تربیت کے بعد جب انسان اپنی منزل کے اس مقام پر پہنچا تو اس کا عہدِ طفولیت ختم ہُوا۔ اور شباب آیا۔ شباب کیا انقلاب آیا مشرق و مغرب کا وہ سب سے بڑا انقلاب جس کو بروئے کار لانے کے لئے زمین آسمان چکر میں تھے۔ انقلاب آیا اور اس شان سے کہ اس خدائی سیلاب کے تُند و تیز ریلے میں ہر غیرِ الٰہی قوت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی نسل و وطن

کے بُت پاش پاش ہو گئے۔ بلند و پست کی تخصیص مٹ گئی۔ محمود و ایاز ایک ہو گئے بندہ و بندہ نواز باہم شیر و شکر ہو گئے۔ اَسود و اَحمر کا امتیاز بیک قلم اُٹھ گیا قیصری و سکندری کے پُر غرور سر جھک گئے اور ان سروں کو زینت دینے والے تاج و کُلاہ، اونٹ چرانے والوں کے قدموں میں آگرے۔ کفر و شرک۔ زنا چوری۔ قتل۔ ڈاکہ۔ لوٹ مار۔ سلب و نہب۔ فسق و فجور اور ناخدا ترسی کا رنگ عمیر کائنات سے اڑ گیا۔ رہبانیت اور برہمنیت کی ظلمت انگیز گمراہیاں فاران کی تجلیوں سے کافور ہو گئیں۔ قلوب کچھ اس طرح صیقل ہوئے کہ ابدی و ازلی حقیقتیں اُن میں جھلکنے لگیں۔ سارے امتیاز مٹ کر صرف ایک امتیاز کفر و ایمان باقی رہ گیا۔ بزرگی اور نیکی کا معیار صرف خوفِ خدا ٹھہرا۔ مشرق و مغرب میں اللہ کا نام گونجنے لگا۔ لمن الملك اليوم ؕ لله الواحد القهار کا سماں پیدا ہو گیا۔ اور وہ فرشتے بھی جنھوں نے حضور ربِّ دواں میں انّی جاعل فی الارض خلیفہ سُنکر اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفك الدماء کہنے کی جسارت کی تھی انّی اعلم ما لا تعلمون کے اسرار و رُموز بے حجاب دیکھ کر سر بگریباں رہ گئے۔

۶۰۔ اس انقلاب کی نوعیت

انقلاباتِ عالم کی تاریخ پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالیئے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ ہر انقلاب کی تہ میں ایک خاص نظریۂ حیات View Point of Life اور ایک خاص تصورِ کائنات World Picture تھا جو اس کو رونما کرنے کا باعث ہوا۔ پھر ایک دوسری طرح ان انقلابات پر نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکام رہے بعض فکر و عمل کے بحرِ ناپیدا کنار میں ایک ہلکی سی لہر بھی پیدا نہ کر سکے۔ اور بعض نے وہ طوفانی ہنگامے پیدا کئے کہ آج تک ہر موج محشر بداماں ہے۔ انقلاب کی اثر اندازی کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ تغیّر و تبدل کی گہرائی اور رسائی کہاں تک ہے۔ یہ سب کچھ اُس نظریہ پر موقوف ہے جو انقلاب کی روح کے طور پر کام کرتا ہے۔ پھر نظریہ کی بلندی یا پستی بھی اپنی جگہ پر انقلاب پیدا کرنے والے بلند یا پست شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اکثر انقلابات ایسے تھے جو صرف خیالات میں ایک خفیف سا تموّج پیدا کر کے رہ گئے۔ ذہنیتوں اور سیرتوں پر موت اور زندگی پر کوئی نقش نہ چھوڑ سکے۔ اور چند انقلابات ایسے بھی ہیں جن کی آمد سے کائنات پگھلی ہوئی موم کی طرح ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی۔ اسلام جو مشرق و مغرب کا سب سے بڑا انقلاب ہے، اس ثانی الذکر نوعیت کا انقلاب ہے۔ یہ مکمل ترین

اور عظیم ترین انقلاب یا اعجاز ہے۔ دنیا کے مکمل ترین اور عظیم ترین انسان کی مختصر سی زندگی کا۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ نظریہ حیات کو بدل دیا۔ بلکہ ایک بالکل اچھوتا اور جدید تصور کائنات پیش کیا۔ جس سے فکر و عمل۔ جذبات و حسیات۔ آرزوؤں اور اُمنگوں کی دنیا ہی دِگرگوں ہو گئی۔ دو لفظوں میں محمد عربیؐ نے عالم انسانی کو ایک اجتماعی اور ہمہ گیر ضمیر بخشا وہ ضمیر جس میں یزداں کی مشیت جھلک سکے۔

اور انقلابات کی طرح اسلام بھی ایک پیغام لایا۔ اور وہ پیام ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ۔ موسیٰ اور عیسیٰ بھی یہی پیغام لائے اور انبیائے ماسبق بھی۔ لیکن جو بات لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ میں ہے وہ لا الٰہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ میں ہے نہ لا الٰہ الا اللہ عیسیٰ روح اللہ میں۔ اس لئے کہ موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ کا مشن ساری دنیا کے لئے نہیں تھا اور نہ ہی یہ اُن کا دعویٰ تھا۔ اُنکا خطاب محدود تھا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا جلال و جمال موسیٰ و عیسیٰ کے ہاں بھی وہی تھا جو محمدؐ (فداہ ابی و اُمّی) کے یہاں ہے۔ مگر لا الٰہ الا اللہ کی پوری اور عالمگیر تجلی پہلی مرتبہ محمد رسول اللہ نے فاران سے بے حجاب کی ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسّمی !

غارِ حرا سے اُتر کر آنے والا رسول کائنات جو نسخہ کیمیا اپنے ساتھ لایا وہ صرف قریش یا عرب کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ مشرق و مغرب کی اُمنگوں

اور پوری کائنات کے لئے ہے رسولِ عربی کا نظریہ توحید صرف اعتقادی ٹوٹکا ہی نہیں ۔ بلکہ موجودات کی ہر شئے کا بھی اصولِ حیات ہے ۔ بخوفِ طوالت مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ اسلام نے جو انقلاب رونما کیا وہ ہے انقلابِ توحید ۔ خدا کے آخری پیغام نے ایک خدا کا تصوّر پہلی مرتبہ کائنات گیر طور پر پیش کیا ۔ یہ توحید صرف خیالی اور اعتقادی توحید نہیں اس توحید کا مقصد عملی زندگی کی مکمّل توحید ہے ۔ انسانی گروہوں کی توحید ہے ۔ ان گروہوں کی راہ سفر اور منزل کی توحید ہے ۔ یہ سارا "ایکا" اس لئے ہے کہ خدا ایک ہے ۔ اور اُسی کی طرف ساری کائنات کو جانا چاہیئے وَاِلَی اللہِ ترجع الاُمور ۔

۷. ختمِ نبوّت کی حکمت

خاتم النبیّین کے ذریعے خدا نے اپنا آخری پیغام اس لئے بھیجا کہ جس عظیم الشان مقصد کے لئے آدم کی تخلیق ہوئی تھی اور جس کے پیش نظر ہزاروں برس تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس کی الہامی تربیت کرتے رہے وہ آخری اور مکمّل طور پر انسانوں پر واضح کر دیا جائے محمّد عربی کے ہاتھوں دین کی تکمیل کے معنی ہی یہ ہیں کہ صدیوں کی نسلی ۔ وطنی اور فرقہ دار تعلیم و تربیت کے بعد تمام نوعِ انسان کو بلا امتیازِ نسل و رنگ اس منزل کا پتہ دیا جائے جو سب کی مشترک منزل ہے ۔ اتمامِ نعمت یہی ہے ۔ نوع

انسانی اس کے بعد نئے نئے رسولوں اور نئی نئی شریعتوں کی آمد سے فرقوں اور گروہوں میں نہ بٹی رہے بلکہ متحد ہو کر ایک عالمگیر برادری بن جائے ربّ العٰلمین کے بھیجے ہوئے رحمۃً للعٰلمین رسول نے اسی لئے اِنِّی رَسُولُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا فرمایا۔ اس رسول کی اُمّت اسی لئے خیرِ اُمّۃ ہے کہ وہ صرف ایک ہی رنگ صبغۃ اللّٰہی میں رنگی ہوئی ہے اور اِسی میں سب کو رنگ دینا چاہتی ہے ؎

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است — وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم!
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — ما کہ یک جانیم از احسانِ اوست
تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود — ہستیِ ما با ابد ہمدم شود!
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایّام را — او رُسُل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخری جامے کہ داشت

لا نبی بعدی ز احسانِ خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفٰے است

(اقبالؒ)

۸۔ اخوت و اجتماعیت

وحی و الہام کا سلسلہ خلافتِ الٰہی کو قائم کرنے والے سپاہی تیار کرنے کے لیئے تھا۔ انفرادی اور قومی تربیت کے بعد جو شئے سب سے زیادہ اہم تھی وہ تمام انسانوں کی مرکزی اور اجتماعی تربیت تھی یا بالفاظِ دیگر سب جماعتوں کو توڑ کر صرف ایک ہی جماعت تیار کرنا تھا۔ جس میں ساری خوبیاں جمع ہوں۔ خدا کا آخری مذہب آیا ہی اس لیئے تھا کہ انسان کو بے شمار خداؤں سے نجات دلا کر ایک خدا کے سامنے جھکا کر سر بلند کرے۔ توحید کی روح پھونکنے کے بعد اس روح کے جو مظاہر مقرر فرمائے گئے اُن میں بھی اس اجتماعیت کو بروئے کار لانے کی قوت پنہاں رکھی گئی۔ مثلاً :-

۹۔ کلمہ

بنی نوع انسان کے لیئے ایک ہی Moto کلمہ مقرر کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ توحید کی روح جن پاک اور بلند جذبات کو پیدا کرے اُس کے اظہار کا طریق بھی ایک ہی ہو۔ دلوں سے ایک ہی صدا نکلے۔ کانوں تک ایک ہی آواز پہنچے اور سب کو ایک ہی زندگی بخش تاثیر سے ہنگامہ در آغوش کرے۔ یہ کلمہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اس میں

سب سے پہلے تمام مصنوعی اور خود ساختہ خداؤں کے خلاف ایک عام اور بے پناہ بغاوت کا اعلان ہے۔ جب انسان لآ الٰہ الاّ اللہ کہتا ہے تو اس کا سرِ عقیدت ہر فرعونِ بے ساماں کے آگے سے بے خوف و خطر اُٹھ جاتا ہے اور الاّ اللہ کہنے کے بعد صرف ایک اور ایک ہی حقیقی اور ہمہ گیر قوت کے آگے جھک جاتا ہے۔ جس کی توفیق سے تمام قوتوں سے بغاوت اور تمام زنجیروں سے رہائی کی نعمت نصیب ہوئی۔ محمدؐ رسول اللہ کہہ کر انسان دنیا کے اس سب سے بڑے انسان۔ اُس سب سے بڑے محسن کا شکریہ ادا کرتا ہے جس کی رہنمائی کے طفیل یہ سب کچھ حاصل ہوا۔ محمدؐ کی ذاتِ گرامی لا الٰہ الاّ اللہ کہنے والوں کے لئے شیرازہ بندِ قوّت کا کام کرتی ہے۔ لَا تمام زنجیریں کاٹ دیتا ہے اور اِلاّ زندگی کو احساسِ محکم عطا کرتا ہے۔ یہی نفی و اثبات ہے جس میں ہر قوّتِ باطل کی شکست و ریخت اور ہر سچائی کی تثبیت و فروغ کا راز مضمر ہے۔ انہی دو حقیقتوں کو سمجھنے سے اُمّتیں زندہ ہوتی ہیں اور انہیں کو نہ سمجھنے سے قومیں مرتی ہیں ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال
اُمتاں را لَا جلال اِلاّ جمال

لَا و اِلاّ احتسابِ کائنات
لَا و اِلاّ فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون
حرکت از لَا زاید از اِلاّ سکون

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لَا ست
این نخستین منزلِ مردِ خدا ست

ملتے کز سوزِ او یک دم تپید
از گِلِ خود خویش را باز آفرید

پیشِ غیر اللہ لَا گفتن حیات
تازہ از ہنگامۂ او کائنات

لَا و اِلَّا سازِ و برگِ اُمّتاں
نفیِ بے اثبات مرگِ اُمّتاں

۱۰۔ نماز

نماز کو بہترین عبادت کہا گیا ہے۔ اس میں تمام وہ صفات یکجا جمع ہیں جو پیغامِ محمدی اپنے مخاطبوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ سب سے پہلی چیز تو وہی توحید ہے جس کا ذکر چند لفظوں میں اوپر کر دیا گیا ہے۔ نماز اس امر کا عملی ثبوت ہے کہ اسلام صرف چند عقائد و رسوم کا ہی مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی پوری زندگی بلکہ حیات بعد الممات پر بھی پوری طرح حاوی ہے۔ وہ مذہب، مذہب ہی نہیں جو سفرِ حیات کی ہر کٹھن منزل میں انسان کی رہنمائی نہ کر سکے۔ وہ "دین" ٹھکرا دینے کے قابل ہے جو حیاتِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے چند تاریک اور غیر اہم حصّوں میں اپنی پناہ گاہ تلاش کرلے اور باقی ساری زندگی کو بے مہار چھوڑ دے اسلام کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ تمام زندگی کو ایک مستقل اور اٹل سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس میں جتنی چیزیں "مذہبی" ہیں وہ بھی عملی زندگی کی تربیت و تشکیل کے لئے ہیں۔ نماز اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے ایک خاص طریقِ عبادت ہے۔ دوسرے مذہب کے تماشائیوں کے لئے اور بد قسمتی سے آج خود مسلمانوں کی غالب اکثریت کے لئے یہ ایک "ایسی جبری اُٹھک بیٹھک"

(معاذاللہ) سے زیادہ کچھ نہیں جس سے خدا اور رسول خوش ہوتے ہیں" لیکن آہ! ہم نہیں غور کرتے کہ نماز اس سے وراء الوراء بھی بہت کچھ ہے۔ قرآن نے کئی سو جگہ نماز قائم کرنے کی شدید تاکید کی ہے۔ رسول اکرمؐ نے اس کو معراج المومنین فرمایا ہے۔ اس تاکید و ترغیب کا مقصود بھی وہ مبنی بر توحید اجتماعیت، اخوت اور مساوات قائم کرنا تھا جس کے بغیر اللہ کی خلافت قائم نہیں ہو سکتی۔ امیر و غریب، شاہ و گدا، عارف و عامی۔ بلند و پست، گورے کالے۔ ایک ہی صف۔ ایک ہی امیر (امام)، امیر کی ایک ہی آواز پر ایک ساتھ بلا چون و چرا اُٹھتے اور بیٹھتے ہیں۔ نماز کے فلسفہ پر غور کیجیے تو نگاہِ بصیرت کے سامنے ایک دل افروز اور حیات انگیز دبستان کھل جاتا ہے۔ ایک عظیم الشان راز سے پردہ سرک جاتا ہے۔ اللہ کے سپاہیوں کی جماعت صف بستہ ہو کر حرکات و سکنات۔ اعضاء و جوارح۔ دل اور دماغ۔ سکوت و کلام۔ قعود و قیام اور ہر ممکن طریق سے اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بُتانِ آذری!

دن میں پانچ بار بلا ناغہ بچے۔ بوڑھے۔ مرد و زن اللہ کی توحید کی گواہی دے کر اس کا عہد کرتے ہیں کہ اللہ تو ہی حقیقی بادشاہ ہے۔ اس طرح اللہ والوں کی عالم آرا۔ بے پناہ اور بلند جماعت اپنی تربیت کرتی ہے تاکہ اپنے اسی ساز و سامان کے طفیل وہ مشارق و مغارب پر چھا جائے ؎

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

۱۱- روزہ

روزہ سے وہ صبر و استقلال۔ ضبط و سکون اور تحمّل علی الشّدائد پیدا کرنا مقصود تھا۔ جو ہر اولو العزم اور باوقار جماعت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ سال میں مہینہ بھر طلوعِ آفتاب سے غروب تک بھوکا پیاسا رہنے کو اس لئے فرض کر دیا گیا کہ اللہ کا نام بلند کرنے والی جماعت میں اپنی جانوں پر کھیل کر کامیاب ہونے کی تڑپ زندہ اور پائندہ رہے اور لذّاتِ نفس۔ عیش پسندی اور لہو و لعب کا وہ مرض پیدا ہی نہ ہو جو ہر مرنے والی اُمّت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مثلاً فرانس جیسی عظیم الشان۔ جابر و قاہر اور عالمگیر سلطنت کو جو شئے ایک ہفتے کے اندر تہس نہس کر گئی وہ بھی آرام طلبی۔ نا ؤ نوش شیطانی رقص و سرود اور اجتماعی و اخلاقی موت تھی۔ لیکن آہ جب مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہؤا ہے وہ رفتہ رفتہ اس عظیم الشان سبق کو بھولتا گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ یہ مجاہدانہ عمل بھی ثواب لوٹنے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا! آج مسلمان آمدِ رمضان سے گھبرانے لگا ہے۔ اور صحت کو گرنے سے بچانے کے لئے یا تو روزہ رکھتا ہی نہیں یا دو دو مہینے پیشتر ہی پُر تکلف اکل و شرب اور بہترین عیش و عشرت کے سامان جمع کر کے قلعہ بندی

شروع کر دیتا ہے۔ کہ بھوک اور کمزوری کے حملہ سے محفوظ رہ سکے سہ

مسلم ہندی شکم را بندہ
خود فروشے دل ز دیں برکندہ

۱۲- حج

• اجتماعیتِ اسلام کا سب سے بڑا مظاہرہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کانفرنس اور حقیقتاً سب سے بڑی نمائش حج ہے روئے زمین کے مومنوں کی جو چھوٹی چھوٹی جماعتیں روزانہ ہفتہ وار اور سالانہ محلوں، شہروں اور عید گاہوں میں جمع ہوتی ہیں۔ اُن کو سمیٹ کر عمر بھر میں کم از کم ایک بار ایک ہی مرکز پر صف آرا کرنے کی سبیل ہے۔ یہ اللہ کے سپاہیوں کی سالانہ **Rally** ہے جو کفن بدوش اور سر برہنہ ایک ہی یونیفارم میں اپنے خدا سے دیوانہ وار عشق کا مظاہرہ کرنے جمع ہوتے ہیں۔ میدانِ عرفات کا یک رنگ اجتماع اس امر کا اعلان ہے کہ خدا صرف ایک ہی ہے۔ محمدؐ ہی خاتم النبیین ہیں سب انسان برابر ہیں۔ کوئی اونچ نیچ نہیں۔ اس سب کچھ سے بڑھ کر حج کا مقصود حقیقی یہ ہے کہ مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں ایک مرکز سے بندھے رہیں ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد۔ غم اور خوشی میں شریک ہو سکیں اُن کا باہم اتحاد اور اتحاد اس درجہ گہرا اور قوی ہو کہ اُن کی قوت کو کوئی حیلہ۔ کوئی طاقت پارہ پارہ نہ کر سکے۔ ہر سال اجتماع کے معنی ہی یہ ہیں کہ

اس اُمّت کے فرزند دنیا کو سر کرنے کے لئے نئے نئے ولولے۔ تازہ حوصلے مضبوط ارادے بے تاب آرزوئیں اور جوان اُمنگیں لے کر جایا کریں۔

پھر یہ حج استطاعت والوں کے لئے فرض قرار دیا گیا۔ تاکہ یہ لوگ اپنی پوری استطاعت کو نذرِ دین و ملّت کرنے کا سبق سیکھیں۔ مگر یہاں معاملہ ہی اُلٹا ہے۔ بجائے اس کے کہ مالدار اور پڑھا لکھا طبقہ اس سب سے بڑے قومی اجتماع میں شرکت کر کے خود زندہ ہوتا اور ملّت کو زندہ کرنے کی سعی کرتا دیگر شعائرِ اسلام کی طرح حج بھی بیچارے اُن غریبوں کے لئے رہ گیا جو اپنے شوقِ فراواں سے مجبور گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ اور جہازی ٹکٹ کی امید میں برسوں کراچی اور بمبئی کے حاجی کیمپوں اور گلیوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ ہمارے امیر، وزیر، خان بہادر اور خان صاحب حضرات اگر حج کا قصد فرماتے بھی ہیں تو اس وقت جب وہ ہر طرف سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ جب منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت نہیں رہتی۔ ہاتھ پیر شل ہو چکتے ہیں۔ دل و دماغ پر پیری کا رنگ چڑھ چکتا ہے۔ غرضیکہ جب کسی کام کے نہیں رہتے۔ تو حاجی صاحب" بننے کی سوجھتی ہے۔ اِن اللہ کے بندوں کو کون سمجھائے کہ حج کی روح یہ نہیں ہے۔ صحت و جوانی کے عالم میں عیش و عشرت کی مستی اور دولت کے خمار میں یہ بزرگ قصد فرماتے ہیں تو لندن کا۔ اور وہ خدا کا وہ سب سے پہلا گھر جس کو برکت اور ہدایت سے موسوم کیا گیا ہے ایک طرف رہ جاتا ہے۔ شاید اُن کا یہی خیال ہوتا ہے کہ

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے!

حریفوں کو اگر کوئی چیز ناگوار ہے تو وہ مسلمانوں کی قوتوں کا سمٹنا اور اُن کو سمیٹنے کا سامان کرنا ہے۔ فرداً فرداً غلام مسلمان کو شریعت۔ طریقت۔ ولایت اور "نبوّت" تک دا! کی اجازت دی جاسکتی ہے مگر جو چیز زہر قہر اور غضب ہے وہ مسلمان کی مرکزیت ہے لَا اِلٰہ کہنے والوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے دیا جائے تو قیامت سے پہلے قیامت نہ آجائے؟

یوں تو "ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ـــــ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی" مگر مسلمانوں کی رہی سہی اجتماعی خو بو کو مٹانے کی جو بے پناہ سعی گذشتہ دو صدیوں اور خصوصاً پچھلے پندرہ بیس برس میں کی گئی ہے وہ خون کے آنسو رُلانے والی ہے۔ ۱۹۰۳ء میں تقریباً ایک لاکھ حاجی صرف ہندوستان سے گئے۔ ہندوستانی حاجیوں کی یہ تعداد گھٹتے گھٹتے ۱۹۲۶ء میں صرف ۳۶ ہزار رہ گئی چھ سال بعد یعنی ۱۹۳۲ء میں ۳۶ ہزار سے دو تہائیاں گھٹ کر ۱۳ ہزار ۱۹۳۳ء میں دس ہزار اور ۱۹۳۴ء میں ۹ کروڑ ہندی مسلمانوں میں سے صرف ۹ ہزار کو "حالات" نے حج کی اجازت دی! ۱۹۳۴ء میں تمام زائرینِ حرم کی تعداد صرف چھبیس ہزار تھی۔ گویا جتنے حاجی ۱۹۲۶ء میں صرف ہندوستان سے گئے تھے اس سے بھی دس ہزار کم! یعنی اوّل تو حج رہ ہی ایک رسم گیا تھا اور پھر وہ رسمِ کہن بھی گھٹتے گھٹتے یہاں تک آپہنچی ہے![۱]

---

[۱] دیکھو "مقالات" علامہ مشرقی۔

۱۳- زکوٰۃ

سب سے آخری اور بے حد اہم رکنِ دین زکوٰۃ ہے! زکوٰۃ کا مقصود یہ تھا کہ جو روحانی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور اجتماعی نظام کلمہ شہادت۔ نماز روزہ اور حج سے پیدا ہو اُس کو اقتصادی طور پر ناقابلِ شکست و ریخت بنا دیا جائے۔ علاوہ ازیں دولت کی تقسیم اس طرز پر ہو کہ کوئی امیر نہ رہے کوئی غریب نہ رہے۔ مگر آہ! تخت و تاج کے ساتھ زکوٰۃ کا نظام بھی گیا اور عملاً وہی کچھ ہو کر رہا جس کو مٹانے اور روکنے کے لئے امیر المومنین صدیق اعظم نے مسیلمۂ کذّاب کی نبوت کا تار و پود بکھیرا تھا!

اسلام کا مقصود اصلی انسانوں کی ایسی اجتماعیت کا قیام تھا جس میں شرفِ انسانی کے سارے کمالات پوری شان سے جلوہ گر ہوں۔ جو تمام گذشتہ اُمّتوں کی خوبیوں کا خلاصہ اور اُن کی کمزوریوں سے بلند و بالا ہو۔ جس کا دین سارے دینوں پر غالب آنے والا اور جس کا ضابطہ سارے ضابطوں اور خود ساختہ آئینوں پر چھا جانے والا ہو۔ نبوّتِ محمدی کا یہی امتیازِ خصوصی ہے۔ انہی معنوں میں آپ صلعم خاتم المرسلین ہیں اور اسی جہت اُمّتِ محمدی، خیر الامم اور خاتم الاقوام ہے۔

۱۴۔ ایک سوال کا جواب

یہ سوال حکمائے سیاست کو اکثر پریشان کرتا رہا ہے کہ تمام انسانوں کی ایک ہی جماعت یا ایک ہی سلطنت ممکن ہے بھی یا نہیں؟ اس کا جواب مختلف طریق سے دیا گیا ہے۔ بعض اوقات اس کو واہمۂ خلاق کی نادرہ کاری سے تعبیر کیا گیا۔ اور اگر اس امکان کو تسلیم کیا گیا تو اس کی بنیاد کو ملوکی Utopia اور مادی اصول پر سوچا سمجھا گیا۔ اسی لئے اس سمت میں کوئی سعی مشکور نہ ہو سکی۔ مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ عالم آرا سلطنتیں۔ جہان گیر سطوتیں اس لئے نسیاً منسیا ہو گئیں کہ بنیادیں ہی غلط تھیں۔ اسلام اُمم سابقہ کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے آیا ہے۔ وہ اس قسم کی سلطنت کی تعمیر تو نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ ؎

ملوکیت بدین ما حرام است

مگر وہ ایک جہانگیر برادری ضرور تیار کرنا چاہتا ہے جس کی تاسیس و تعمیر کے اصول عالمگیر۔ اٹل اور فطری ہوں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک نسلی۔ لسانی۔ ملکی زنجیروں کو توڑ کر کوئی جماعت نہ اُٹھائی جائے گی، تمام انسانوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ اسلام جس جماعت کی تخلیق و تربیت کے لئے آیا ہے اس کا نام الہام خداوندی میں حزب اللہ قرار دیا ہے۔ اس کی رکنیت کا معیار مال و دولت ہے نہ جاہ و حشمت۔ نسل و رنگ ہے نہ ملک و قوم۔

بلکہ فقط اعمال صالحہ اور ایمان باللہ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم جب انسان اس معیار پر پورا اترتا ہے تو اس مقام رفیع پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات بن جاتا ہے۔ یہی معیار ہے جو ہر کامیابی۔ ہر بلندی اور ہر راحت و سرور کا اصلی مخزن ہے۔ اس جماعت میں ان اصولوں کے باوجود کیا سارے انسان شامل ہوجائیں گے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ کائنات ایک روحانی اور اخلاقی نظام کے ماتحت چلائی جارہی ہے It is a moral and spiritual order رزم خیر و شر جوہر انسانی کو آشکارا کرنے کے لئے۔ زندگی کو ترقی و ترفع کے مدارج طے کرانے کے لئے ہے۔ بالآخر شر پر خیر غالب ہو کر رہے گا۔ حق سرفراز اور باطل سرنگوں ہو کر رہیگا مزاج انسانی کی بے اعتدالیاں اعتدال پر آکر رہیں گی۔ نسل انسان از خود طوعاً و کرہاً اس ضابطہ کی پابند ہوتی جارہی ہے اور ہو کر رہے گی۔

۱۵۔ معیار اور اصل

اخلاق ہمیشہ ایک معیار یا بالفاظ دیگر ایک Ought پیش کرتا ہے۔ حکمائے مغرب نے معیار کی تعریف یہ کی ہے کہ اس تک کوئی نہ پہنچ سکے۔ لیکن اس تک رسائی کے لئے کوشش جاری رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ Ideal اور Real کا فرق ہی ہے جو ہر سعی و جہد میں جان ڈال کر معجزات زندگی رونما کرتا ہے۔ مگر اسلام کا آئیڈیل تو ایسا ہے کہ اس پر دنیا کا کامل ترین

انسان پہنچ چکا ہے۔ اور اس کے سچے نام لیوا اس پر ٹھیک اُتر چکے ہیں۔
اس معیار کے قابل سارے انسان اپنے آپ کو بنا سکیں یا نہ بنا سکیں
اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ اُن اصولوں کی تطہیر و تنفیس ہے جن پر اخوّت
انسانی صحیح معنوں میں تعمیر ہوتی ہے۔ جماعت کی ترتیب و ساخت کے لئے
سب سے پہلی چیز افراد کی سیرت اور اس کے بعد اجتماعی کردار ہے۔
اسلام نے انفرادی اور سوشل اخلاق کو جو بلند قدر **Higher Value**
اور نفیس معیار **Refined Standard** دیا ہے اس کی مثال کہیں
نہیں ملتی۔ ابھی ابھی عرض کیا گیا تھا کہ اسلام سے پیشتر مذاہب کا خطاب قومی
وطنی اور نسلی تھا۔ ان کی تعلیمات میں وہ اجزاء ضرور موجود تھے جو نتیجۃً
وحدتِ انسانی کی طرف رہنمائی کرنے والے تھے مگر کچھ تو ذہن انسانی
کے پست ارتقائی مدارج کی وجہ سے اور کچھ ان پیغاموں کی جزوی اور
نوعی حیثیت سے وہ عالم آرا اور قلوب گیر انقلاب نہ پیدا ہو سکا جو اسلام
کی الہامی تعلیم نے پیدا کر دیا۔ اور اس کا راز وہ خالص توحید ہے۔ جس پر
نظام اسلام تعمیر ہے۔ ساڑھے تیرہ سو سال میں اس کا جو اثر ہوا ہے وہ
ظاہر و باہر ہے آج ہر طرف یہی پکار ہے کہ دنیا کے تفرقے مٹنے چاہئیں یہاں
تک کہ جنگیں بھی امن۔ وحدتِ آدم۔ حقوقِ انسانی آزادیٔ فکر و خیال وغیرہ
وغیرہ کے نام پر لڑی جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نیکی کے نام پر شرارت جبر انگیزی
کے نام پر اہلیت دورِ حاضر کی مردود سیاست کی پیداوار ہے۔ مگر بہرحال
ان تمام دعاوی کی تہ میں ایک عالمگیر ضمیر ہے جو بول رہا ہے۔ اسی ضمیر کو اسلام

اُبھارتا اور زندہ کرنا چاہتا ہے۔ آج تہذیب یافتہ اقوام کے لئے بعض دیدہ دانستہ دھوکے ہلاکت انگیز ثابت ہو رہے ہیں مگر آخر ایک دن یہ کالعدم ہو کر رہیں گے ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

نئی تہذیب کے فرزند قولاً تسلیم کریں یا نہ کریں عملاً وہ اسلامی تعلیمات کی طرف جانے پر مجبور ہیں۔ یہ صرف ایک دعویٰ ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ دُنیا کے لئے کوئی اور چارہ ہی نہیں۔

باب دوم

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملّت است۔
فرد می باید ز ملّت انتظام
ملّت از افراد می گیرد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

(اقبالؔ)

۱۴- قیام جماعت

باب اول میں "ختم نبوت کی حکمت" اور ضمنی عنوانات کے ماتحت جو گزارشات پیش کی گئی ہیں اُن کا مقصود اس حقیقت کو واضح کر کے دکھانا ہے کہ اسلام انفرادیت کا قائل نہیں بلکہ اجتماعیت کی تعمیر اور تحفظ کے لئے ہے۔ جماعت اور اسلام سیاست اور مذہب سلطنت اور دین لازم وملزوم ہیں۔ ایک شے جسم ہے تو دوسری روح ایک کا تصور دوسرے کے بغیر نامکمل ہے۔ جہاں یہ دونوں علیحدہ ہوئے۔ دین دین نہیں اور سیاست سیاست نہیں سے اس لئے کہ ؎

این دو قوت حافظ یک دیگرند

دین وسیاست کی تفریق پر جس جہت سے بھی غور کیجئے گا اس میں خامی ہی خامی نظر آئے گی۔ اسی تفریق یا صحیح الفاظ میں انسانی حیات کی اس بے دردانہ قطع وبرید کی نذر میں دین اور سیاست کا وہ ظلمت انگیز اور دل افگن تصور ہے جو دین محمدؐ (فداہ ابی وامی) کے علاوہ قریباً دنیا کے تمام قابل ذکر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً اس مذہب اور سیاست کو دیکھئے جو کلیساؤں اور یورپی شہنشاہیوں

کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔ دین چند پرائیویٹ عقائد و رسوم کا نام ہے جن کا عملی اور اجتماعی زندگی پر کوئی مفید اثر نہیں۔ دین زندگی کا ایک ضمیمہ ہے اور بس۔ کارزارِ حیات میں اس کی حیثیت Camp-Follower سے زیادہ کچھ نہیں۔ زندگی کے زندہ ہنگاموں کے لئے اس میں کوئی اثبات نہیں، کوئی تاکید Emphasis نہیں۔ دنیا کے بکھیڑوں اور الجھیڑوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک تنگ و تاریک گوشہ میں گردن جھکا کر آنکھیں میچ لینے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آرزوؤں کی دنیا کو برباد کر دینا۔ امنگوں کی بستی کو اجاڑ دینا۔ تمناؤں کے چمن کو ویرانہ بنا دینا ہی نیکی ہے۔ ہر ممکن طریق سے نفس کو مار دینا یعنی تدریجی خودکشی Self Mortification ہی روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ یہ منفیاتی کوشش یہ استہلاک، "آسمانی بادشاہت" کی طرف پرواز ہے! جتنا آسمان زمین سے دور ہے اتنی ہی "آسمانی بادشاہت" زمین کے ہنگاموں سے دور ہے۔ لہٰذا اس آسمانی بادشاہت کے لئے "زمینی بادشاہت" کو چھوڑ دینا ہی پہلی شرط ہے ؎

شرطِ اول قدم آنست کہ راہب باشی!

مختصراً یہ تھا مذہب کا تصور، جو عیسائی تعلیمات نے لوگوں میں پیدا کیا۔ بابِ اوّل کی ابتدأ میں عرض کیا گیا تھا کہ انسان احسن التقویم ہے تسخیرِ کائنات اس کی فطرت ہے۔ زندگی میں زندگی کی آرزو اُس کا حق ہے! انسانیت کے تقاضوں کو کوئی قوت نہیں دبا سکتی۔ رہبانیت کے سرد پنجے میں رِسکنے والی عیسائی دنیا صدیوں کی گہری نیند کے بعد بیدار ہوئی تو اس کو اپنے دین

بہ "نظر ثانی" کی ضرورت بُری طرح محسوس ہوئی مارٹن لوتھر کی تحریک جس کے بعد یورپ کی نشاۃ ثانیہ Renaissance شروع ہوتی ہے اس مرگ آسا اور خواب آلود مذہب کے خلاف پہلی اور کامیاب بغاوت تھی۔ عیسائی دنیا کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے تک اصلاح و تجدد کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس ریس کے گھوڑوں کو مادیت نے وہ زور دار ایڑی لگائی کہ توسط و اعتدال کی تمام جائز حدود پھاند گئے۔ سائنٹفک ترقیات اور صنعتی انقلاب کے پروردہ یورپ نے طے کر لیا کہ "مذہب" انسان کی راہ حیات کا سب سے بڑا روڑا ہے جس کو ایک طرف لڑھکا دینے ہی میں نجات ہے۔ جدید افکار کی تند رو تعقل Rationalism کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور مادیت کی اٹھتی ہوئی آندھی میں رہبانی مذہب نے کسی جائے پناہ کی تلاش کی۔ نئی سحر طلوع ہو چکی تھی۔ ہر چیز آنکھیں مل مل کر بیدار ہو رہی تھی۔ پناہ کہاں تھی! شہنشاہی ہوس رانی نے دیکھا کہ ظلم و ستم جب تک مذہب کے نام پر نہ ہو کامیاب نہیں ہو سکتا مذہب نے بھی محسوس کیا کہ مسند بر سلاطین و ملوک کے ایوانوں کے علاوہ اور کوئی مامن و ملجا نہیں مل سکتا۔ چنانچہ روما اور یونان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہاں "دین" و "سلطنت" میں مداہنت Tolerance اور مفاہمت کا رنگ زیادہ گہرا تھا۔ عیسائی دین و سیاست کی یہ باہمی سرپرستی رگ انسانیت کے لئے دو دھارا خنجر ثابت ہوئی۔ مرے کو مارے شاہ مدار کچھ تو "مذہب" نے زندگی کو زندگی سے محروم کر دیا تھا جو رہا سہا کام تھا وہ ملوکی جور و استبداد نے تمام کر دیا۔ سولھویں اور سترھویں صدی کی تاریخ کا ورق

ورق اس پر شاہد ہے ۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلاب اور ۱۹۱۷ء میں روس کا خونی سیلاب اسی ستم پرور ملی بھگت کا ردعمل تھا۔ سلطنت نے پھر ایک بار مذہب سے پیچھا چھڑایا۔ "دین" و "سیاست" کے دائرے الگ الگ کر دیئے گئے۔ ایک طرف نمرودی شان و شوکت۔ فرعونی جاہ و جلال۔ اجتماعی غارت گری۔ استعماری لوٹ مار، لاعلاج جوع الارض اور ابلیسی حیلہ سازی سے "سیاست" کا قوام بنایا گیا۔ دوسری طرف مسکینی و دلگیری۔ مظلومی و نخچیری۔ نامرادی و بربادی۔ تباہی و حیاں کاہی کو "دین" سے موسوم کیا گیا!

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سر بزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری

ہوئی دین و ملت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری!

لیکن

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری

عالم انسانی کے غمگسار طبیب نے نہ صرف یہ کہ اس کی ظاہری و باطنی بیماریوں کی تشخیص کر کے نسخہ تجویز فرمایا بلکہ صحت و تنومندی کے ساتھ زندہ رکھنے کے لئے احتیاطی تدبیر بھی بتلا دی۔ یہ تدبیر ایک مرکز۔ ایک امیر اور ایک جماعت ہے۔ ایک خدا۔ ایک خاتم النبیین۔ ایک حرم۔ ایک ام الکتاب۔ ایک کلمہ۔ ایک ہی طرز نماز اور نماز میں صف بندی، یہ سارا ساز و سامان اس ایک

جماعت کو پیدا کرنے اور زندہ رکھنے کے لئے ہے۔ اسلام صرف معتقدات ہی کا نام نہیں جو صرف غار و کوہ کے ظلمت افزا ایسکول رہنے اور جمود پرور ماحول کے لئے تجویز کئے گئے ہوں۔ یہ اعتقادات زندوں کی زندہ دنیا کے زندہ ہنگاموں کی تربیت اور اصلاح کے لئے ہیں جو ان کو صحیح و صالح بنا کر ان میں روشنی اور گرمی پیدا کرتے ہیں۔ الغرض اسلام اور انفرادیت دو متضاد چیزیں ہیں۔ قرآن کریم کے نزدیک جماعت ہی ایمان باللہ اور توحید کا عملی مظاہرہ ہے۔ تفرقہ پسند اور حبل اللہ سے الگ ہو جانے والوں کو مشرک قرار دیا گیا ہے۔ اور مشرک کے لئے قرآن کا لب و لہجہ جتنا قہر آلود ہے وہ ہر قرآن خواں پر ظاہر ہے۔ ایک جہانگیر و جہاں آرا جماعت کے بغیر مسلمان اور اسلام کا وجود ہی ناقابل فہم ہے۔ ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

۱۷۔ اس جماعت کی نوعیت

اب تک مختلف پیرایوں سے عرض کیا گیا ہے کہ اسلام اجتماعیت کا علمبردار ہے۔ یہاں اس چیز پر غور کرنا ہے کہ یہ جمعیت کس قسم کی ہے؟ اسلام سے قبل بھی بہت سی جمعیتیں وجود میں آچکی ہیں! اگر اسلام بھی جمعیت پر زور دیتا ہے تو پھر وہ مابہ الامتیاز کیا ہے جس کی سفارش پر اور سارے گروہ ٹوٹ کر اسی ایک میں ضم ہوں۔ وہ بنیاد کیا ہے جس پر اسلام اپنے متعلق لیظہرہ علی الدین کلہ کا دعوے کرتا ہے؟

اسلام سے قبل اور بعد جتنی بھی غیر اسلامی جمعیتیں وجود میں آئیں وہ ملک، نسل، رنگ، زبان اور جغرافیائی حدود و ثغور کی گروہ بندیاں تھیں۔ انسانوں کو انسانوں پر حاوی کر دینے۔ انسانوں کو انسانوں سے جدا کر کے متخاصم فرقوں میں تقسیم کرنے والی تھیں۔ حکیم الامۃ حضرت علامہ اقبال (نور اللہ مرقدہٗ) نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے اس ارشاد پر کہ قومیں "اوطان سے بنتی ہیں" جس تفصیل اور بصیرت سے قرآنی نقطۂ نگاہ کو واضح فرمایا ہے رہتی دنیا تک چراغ ہدایت کا کام دے گی:۔

"نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ تعمیر کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا یا بالفاظ دیگر

یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب وقبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جائے۔ جو زمان ومکان۔ وطن وقوم۔ نسل ونسب۔ ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہے۔ یہ ہے مقام محمدی۔ یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ اس کی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں مگر اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اقوام عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے میں اور باوجود شعوبی قبائلی۔ نسلی۔ لونی اور لسانی امتیازات کے ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے کیا ہے وہ دوسرے ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا "

"انسانی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزیوں کا۔ خونریزیوں کا۔ خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی اُمت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن وسلامتی پر موسس ہو۔ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر وعمل میں حسب منشائے الٰہی منشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار

پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش، اور اس کا قیام سیاسی تدبر کا کرشمہ نہ سمجھئے۔ بلکہ یہ رحمت اللعالمینؐ کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو تمام خود ساختہ تفرقوں اور تعصبات سے پاک کرکے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی النّاس کا خدائی ارشاد صادق آسکے"۔

۱۸- قیامِ جماعت کی شدید تاکید

یہ ہے جس کے لئے الفاظ ہیں وہ جمعیت جس کو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اسی جماعت کو اسلام تسلیم کرتا ہے باقی جو کچھ ہے "الکفر ملۃ واحدہ" کے زمرے میں آجاتا ہے۔ یا انسان "ملت اسلامیہ" میں ہو سکتا ہے۔ یا "ملت کافرہ" میں۔ ملت اسلامیہ وہ ہے جس کا خاکہ حکیم مشرق نے پیش کیا۔ جو جماعت اس معیار پر پوری نہیں اُترتی غیر اسلامی ہے۔ اول الذکر جماعت کا نام اللہ نے اپنی جماعت ——— حزب اللہ ——— قرار دیا۔ ثانی الذکر کو حزب الشیطان کے نام سے موسوم فرمایا۔ ایمان باللہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایمان لانے والا اور سب طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی جماعت میں شریک ہو۔ اور اللہ کی جماعت وہی ہے جو قرآن کریم کی روشنی میں مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرکے زندہ پائندہ سربلند و سرفراز

اور غالب رکھ سکے۔ ایمان اور بے مرکزی منطابق نہیں ہو سکتے مومن جماعت پیدا کرنے اور جماعت سے وابستہ رہنے پر بحکم خدا مجبور ہے۔ اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو پھر ایمان کی حقیقت معلوم! پھر جماعت بھی وہ جماعت جس کی بنیاد خالص توحید پر ہو۔ اسی جماعت کے لئے غلبہ ہے۔ الا ان حزب اللہ ھم الغالبون۔ یہی وہ حصار ہے جس میں امن وسلامتی کی فضا ہے۔ مومن کو اسی حصار میں پناہ لینے کی تاکید کی گئی ہے۔ جو اس حصار سے باہر ہے اس کو شیطان کے نقش قدم پہ چلنے والا قرار دیا گیا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان ۰ انہ لکم عدو مبین (ترجمہ) اے ایمان والو حلقہ اسلام میں پوری پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو وہ تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے" پھر ان لوگوں کو جو جماعت میں بظاہر یا قولاً شامل ہیں مگر عملاً اپنی تفرقہ پسندی سے اس کی تخریب کر رہے ہیں مسلمانوں سے بالکل الگ تھلگ قرار دیا ہے۔ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شیٔ۔ (اے محمدؐ) جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا (فرقے بنائے) اور کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ تمہارا اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔ مومن کو مومن سے ملائے رکھنے والا ایک ہی رشتہ سرمدی ہے اور وہ جماعت ہے۔ جماعت سے الگ رہ کر ایمان کا دعوےٰ ایک ستم ظریفی اور خود فریبی ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی تباہی بربادی۔ ذلت ومسکنت کی طول طویل اور دلخراش کہانی کے سلسلے کوئی

موزوں عنوان تلاش کیجئے تو "بے مرکزی" کے علاوہ اور کوئی نہیں ملے گا۔ مسلمان آج بھی خدا پر ایمان اور رسول کی رسالت پر یقین رکھتا ہے۔ نماز روزہ۔ حج، زکوٰۃ ہر رکن بڑی بھلی صورت میں ہر وقت اور ہر جگہ ادا کیا جا رہا ہے۔ تیرہ صدیاں گذر جانے پر بھی ارکان دین اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ پھر بات کیا ہے کہ مسلمان خوار و زبوں ہے؟ ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

لیکن قرآنی ایکس رے X-RAY کی مدد سے دیکھئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ جسم ملّت کی ریڑھ کی ہڈی میں وہ گودا ہی نہیں رہا جس کی مدد سے وہ اپنے سہارے کھڑا ہوتا اور حرکت کرتا تھا۔ دین اور دین کے نام پر پچاس ہزار رسمیں باقی ہیں۔ مگر وہ روح مفقود ہو چکی ہے جو ایمان کو عمل میں اور عمل کو زندہ و پائندہ نتائج میں جلوہ گر کرتی تھی۔ زبانیں مسلمان ہیں مگر قلوب و اذہان کافر اور ضمیر مرتد ہو چکے ہیں۔ اللہ کے آخری پیغام کے ساتھ مسلمان اجتماعی استہزا اور عملی تلعب کے مرتکب ہو رہے ہیں جس کی سزا دنیا میں مسکنت اور ذلت اور آنے والی زندگی میں جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ افراد میں خال خال ابھی وہ حرارت باقی ہے جو اسلام نے پیدا کرنی چاہی تھی۔ مگر یہاں تو اجتماعی موت و حیات کا سوال ہے۔ اسلام تو آیا ہی اس لئے ہے کہ تمام تفرقے اور گروہ بندیاں مٹا کر بنی نوع آدم کو بلا امتیاز نسل و رنگ ایک کر دے۔ پھر یہ کیونکر قابل

عقوبت ہے کہ اس پیغام کے حامل اور اس کی غلامی کا دعویٰ کرنے والے جن پر تمام اقوام عالم میں سب سے زیادہ اور شدید ترین ذمہ داری عائد ہوتی ہے بلکہ وہ راہ اختیار کریں جس سے اسلام نے سختی سے روکا ہے؟ یہی وہ نکتہ ہے جس کو قرآن کریم نے بار بار مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ مسجد ضرار سے متعلق لا تقم فیہ ابدا کی قرآنی تنبیہ اسی لئے نازل ہوئی تھی کہ یہ قوت اسلام کو پارہ پارہ کرنے والے گروہ منافقین کا دار المشورہ اور ان کی دسیسہ کاریوں کا مرکز بن چکی تھی۔ پیغمبر خدا (صلعم) نے فتنہ و فساد اور مکر و زور کے اس خطرناک اڈے کو اسی لئے جلا دیا تھا کہ یہاں نظام ملت میں روڑے اٹکانے کے منصوبے سوچے جاتے تھے۔ یہ مسجد نہیں بوس اسی لئے کہ دی گئی تھی کہ مرکز ایمان کے مقابلے میں کفر و نفاق کی پناہ گاہ تھی۔

خدا اور رسول اور روح اسلام کو کوئی فعل اس سے زیادہ ناخوش کرنے والا نہیں کہ اسلام کی اجتماعیت کو خفیف سے خفیف صدمہ پہنچے پیارا کلام الٰہی اس پر شاہد ہے۔ رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے ہمیشہ قیام جماعت اور استحکام مرکز کی شدید تاکید فرمائی ہے۔ جماعت کی تخلیق و تعمیر۔ قیام حکومت الٰہیہ کی طرف پہلا قدم ہے اور یہی وہ قوت ہے جو اسلام کو زندہ رکھتی ہے۔ جو قوم اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لئے مامور ہو اس کے لئے ایک زور کے بغیر اور ایک ہو کر اپنی تقدیر کی خود مالک بنے بغیر اور کوئی چارہ نہیں۔ جماعت پیدا کرنے اور جماعت میں رہنے کے اصرار میں بھی حکمت پوشیدہ

ہے۔ بیسیوں احادیث جن سے قرآن کریم کی اس تعلیم کی تائید ہوتی ہے پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں مثالاً چند نقل کی جاتی ہیں۔ اسوۂ رسول کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے مسلمان ——— علماء خصوصاً اور عوام عموماً ——— اس آئینہ میں اپنی سیرت کے خد و خال دیکھیں۔ اور اگر خدا توفیق دے تو غور کریں کہ کیا وہ ان نبوی ارشادات پر عمل کر رہے ہیں؟

(۱) ید اللہ علی الجماعۃ۔ یعنی جماعت (ہی) پر اللہ کا ہاتھ ہے اس حدیث کی حکمت پر غور کیجئے! ساری ملّت کی زندگی کا پیام لئے ہوئے ہے افراد کا زہد و تقدس، فضل و کمال اور امارت و وزارت اپنی جگہ پر بہت خوب۔ مگر جب تک یہ سارا سرمایہ تعمیر ملت میں صرف نہیں ہوتا "غیر اسلامی" اور بیکار ہے۔ افراد جب مل کر ایک مرکز پر آتے ہیں اور مقصد! اللہ کا بنایا ہُوا مقصد ہوتا ہے تو ان تنصروا اللہ ینصرکم کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے یثبت اقدامکم کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) لا صلوٰۃ الا بالجماعۃ ——— "نماز جماعت کے بغیر قابل قبول نہیں"۔ "اُخوت و اجتماعیت" کے ماتحت ارکان اسلام کا ذکر کرتے ہوئے عرض کر دیا گیا ہے کہ نماز اسلامی اجتماعیت کا بہترین مظہر۔ لہٰذا بہترین عبادت ہے۔ لہٰذا انفرادی نماز عند اللہ اور عند الرسول مستحسن اور پسندیدہ نہیں۔ خدا کا صاف کھلم کھلا حکم ہے واركعوا مع الراکعین یعنی مل کر نماز پڑھو۔

(۳) من شذ شذ فی النار "جو جماعت سے علیحدہ ہُوا اسل

بجہنم ہُوا" مرکز ملت سے کٹنے۔ اپنوں سے علیحدہ ہو کر دوسروں کے ساتھ سر رشتۂ اُخوت مضبوط کرنے والوں کے لئے اس سے بہتر اور ٹھکانا ہو بھی کیا سکتا ہے! مگر و من یضلله فلا هادی له۔

(۴) علیکم بالجماعة والسمع والطاعة:۔ اے مسلمانو! تم پر فرض ہے کہ ایک ہی جماعت پیدا کرو۔ پھر اس جماعت کے امام کا حکم سنو اور اس کی اطاعت کرو" مسلمانوں کے لئے حکم تھا کہ وہ بے جماعت زندگی بسر نہ کریں۔ لیکن مرحبا و آفرین کہ محکومانہ بیچارگی نے ان سے یہ لیاقت بھی چھین لی! خدا خدا کر کے ہندی مسلمان نے کروٹ بدلی تھی اور اسکی بکھری قوتیں سمٹ رہی تھیں مگر خود "اپنوں" نے اس قوت کو پارہ پارہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ایک طبقہ اپنے زہد و تقدس کے پندار میں ملت و دین سے خفا ہے تو دوسرا وزارت و امارت کے خمار میں غیروں سے پیمان استوار کر چکا ہے۔ حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ دونوں غارتگرانِ ملّت اور بندگانِ غیر ہیں!

(۵) دوسرے موقعہ پر آپ نے ارشاد فرمایا اگر کسی جنگل میں صرف تین آدمی ہی ہوں، تو اُن کے لئے وہاں رہنا ٹھیک نہیں تاآنکہ ان میں ایک کو امیر مقرر کر لیا جائے۔ (حدیث)

(۶) پھر مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ کسی ایسے شہر کے پاس سے گذریں جس میں بادشاہ (امیر) نہ ہو تو وہ اس شہر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ بادشاہ مظلوموں کے لئے اللہ کا سایہ ہے اور فساد کو روکنے کے لئے اللہ کا

نیزہ ہے"۔ (حدیث)

اس ارشاد کا درس مضمر یہ ہے کہ صرف امیر ہی ہے جو جماعت کی شیرازہ بندی کر سکتا ہے اور صرف جماعتی زندگی ہی ہے جو امن و سلامتی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ جس بستی کو امیر اور جماعت نصیب ہے۔ اس پر خدا کی رحمت۔ اور جس قریہ کا والی وارث اور رکھوالا کوئی نہیں جہنم کدہ ہے جس سے مسلمان کو دور رہنا چاہیئے! بغیر امیر اور جماعت کے اسلامی زندگی کا تصور ایسا ہی ہے جیسے بغیر روح کے بدن کا۔ بغیر سالار کے قافلہ کا۔ یا زیادہ واضح الفاظ میں بغیر رشتۂ تسبیح کے تسبیح کا۔

۱۹۔ قیام جماعت کا مقصد

قیام جماعت کے لئے اس متواتر تاکید پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ معلوم کرنے اور سمجھنے کی یہ بات ہے کہ اس جماعت کا مقصد اصلی کیا ہے۔ اگر قیام جماعت مقصود بالذات ہوتا تو جیسا ابھی عرض کیا جا چکا ہے۔ اسلام سے قبل بھی بے شمار جمعیتیں موجود تھیں۔ کسی ایک کے ساتھ وابستگی کافی ہوتی۔ نیا ضابطہ۔ نئے بنیادی قوانین۔ ایک خاص طرز حیات اور نئی شریعت کی کیا ضرورت تھی؟ اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی جماعت کو دیگر جماعتوں میں ضم ہونے سے روکنے کے لئے بار بار وحی آسمانی کیوں اُترتی رہی۔ مومنوں کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ اور کفار کو دوست

بنانے سے کیوں روکا گیا؟ اس لئے اور محض اس لئے کہ نبی اُمی کی دامن گرفتہ جماعت اپنے مقصد زیست۔ اپنے مرتبہ و مقام، آغاز اور انجام کے لحاظ سے ایک بالکل اچھوتی اور نرالی شان کی مالک ہے۔ قرآن حکیم کی زبانی سنئے کہ وہ عظمت جو اگلی پچھلی اُمتوں میں صرف اُمت محمدؐ یہ ہی کے حصہ میں آئی ہے کیا ہے:۔

کنتم خیر اُمۃٍ اُخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

(ترجمہ) تم وہ بہترین اُمت ہو جو انسانوں کی رہنمائی کے لئے اُٹھائی گئی ہے۔ جو لوگوں کو معروف کا حکم دیتی ہے اور منکر سے روکتی ہے۔

عام طور پر معروف کا ترجمہ "نیکی" اور منکر کا "برائی" کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن اگر قرآن کریم کی روشنی میں عالم انسانی کی اصلی منزل اور پھر ساری اُمتوں میں ملت بیضا کے مقام اور اس کے مشن پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نیکی ہر وہ کام ہے جو خلافت الٰہی کے قیام پر منتج ہو اور برائی ہر وہ کام ہے جو افراد و جماعت کو اس منزل سے دور کر دے! صداقت۔ امانت۔ عدل۔ علم پروری۔ عفّت۔ غریب نوازی وغیرہ اگر نیکیاں ہیں تو اسی لئے جھوٹ خیانت۔ ظلم۔ جہالت۔ ہٹ دھرمی وغیرہ اگر برائیاں ہیں تو اس لئے کہ ان سے اس اجتماعی حیات کا نشو و نما رک جاتا ہے جو اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کی فضیلت کا خلاصہ ہی یہ ہے کہ وہ

خلافت الٰہیہ کے قیام کے لئے اُٹھی ہے۔ اس کا آمر معروف اور ناہی عن المنکر ہونا یہی ہے اور انہی معنوں میں وہ اخص ترین اُمّت ہے ؎

میانِ اُمّتاں والا مقام است!
کہ آں اُمت دو گیتی را امام است!

دوسری جگہ اس اُمت کی شان میں فرمایا گیا :-

وکذٰلک جعلنٰکم اُمّۃً وسطاً لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسولُ علیکم شھیدًا۔

(اے امت محمدیہ) جس طرح ہم نے تم کو قبلہ کے بارے میں فضیلت دی۔ اسی طرح ہم نے تم کو اُمت وسطٰ (یعنی مرکزی اہم ترین اور عادل ترین اُمت) بنایا تاکہ تم دنیا کی تمام قوموں پر اسی طرح نگران ہو سکو جس طرح رسول تم پر نگران اور گواہ ہے۔

جس طرح خاتم النبیین کی ذات خلاصۂ موجودات اور خیر البشر ہے اسی طرح اس رسول اعظم کی حلقہ بگوش اُمّت بھی اقوام عالم کی سرتاج اور خیر الامم ہے۔ یہ فضیلت اور بزرگی انعام ہے۔ اس عظیم الشان کارنامہ کا جو یہ اُمت سرانجام دے چکی ہے اور جس کو بجالانے پہ تا قیام قیامت مامور ہے۔ یہ کارنامہ وہی ہے جس کا ذکر اوپر کی دو آیتوں میں ہو چکا ہے۔

چونکہ معروف کے لئے حکم کرنا اور منکر سے روک دینا صرف وعظ

تلقین اور دعوت و ارشاد سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس اہم فریضہ کے لئے قوت بھی درکار ہے۔ اللہ نے اس اُمت کو زمین پر تمکن عطا کرنے اور اُس کو مشرق و مغرب کا وارث بنانے کا وعدہ بھی فرمایا۔ یہاں اگر یہ شئے واضح طور پر ذہن میں آجاتی ہے کہ جو شئے اسلام اور دیگر ادیان میں مابہ الامتیاز ہے وہ یہی ہے کہ اسلام بغیر حکومت الٰہیہ کے اسلام ہی نہیں رہتا اور اس کے برعکس دیگر مذاہب جب تک حکومت سے پیچھا نہ چھڑا لیں اپنی اصلیت پر نہیں آتے! ؎

اس کو پینے کے لئے چاہیئے ظرف عالی
یہ شراب آئی ہے توحید کے مخانوں سے

خیر اُمتہ سے ارشاد ہوتا ہے:-

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً۔ (سورۃ نور رکوع ۷)

جو لوگ تم میں ایمان لائیں اور عمل صالح کریں اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اُن کو زمین کی حکومت عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پیشتر اس نے ان شرائط کو پورا کرنے والوں کو حکومت عطا فرمائی تھی اور ان کے اس دین کو جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ متمکن کرے گا اور ان کے خوف کو یقیناً امن

سے بدل دے گا۔

پھر یقین دلایا جاتا ہے لن یجعل اللہ للکٰفرین علی المؤمنین سبیلاً۔ اللہ مومنوں پر کافروں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ مومنوں کی مدد اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے وکان حقاً علینا نصر المؤمنین۔ مومنوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ صحیح معنوں میں مومن ہیں تو وہی دنیا میں سب سے زیادہ اونچے اور سربلند ہوں گے۔

تمکن فی الارض کا مژدہ۔ مومنوں کو غالب اور کافروں کو مغلوب رکھنے کا وعدہ یہ سب کچھ اسی لئے تھا کہ مومن کفن بر دوش اللہ کا نام بلند کرنے اور صرف اسی کی حکومت قائم کرنے اُٹھا تھا۔ یہی اس کا جنون تھا جو اس کی رگ رگ میں بجلیاں بھر کر اشداء علی الکفار بناتا تھا۔ یہی للّٰہی جذبہ تھا جس نے ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم کے مصداق ہر طرف خدا کی رحمت اور نصرت کو اپنا عناں گیر بنایا۔

ان تصریحات کے بعد یہ ذہن نشین ہو جانا چاہیئے کہ اللہ اور اس کے برگزیدہ رسول نے جماعت کے قیام پر زور اسی لئے دیا ہے۔ اور جس جماعت کے قیام پر زور دیا ہے وہ جماعت مومنین قانتین کی خالص جماعت ہے جس کا مقصد زیست قوموں کی رہنمائی و رپاسبانی ہے۔ قوموں کی ہدایت اور نگرانی کا فریضہ اس قدر اہم اور مشکل ہے کہ بغیر قوت امت کے ادا ہو نہیں سکتا۔ مسلمان جب تک مسلمان ہے اس کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں کہ وہ ایک مرکز سے مربوط ہے۔ اللہ کو ہجوم

مومنینؓ کی ضرورت نہیں کہ اس کے دین کو صف بستہ۔ کمر بستہ۔ طوفان سے ٹکرا جانے والوں کی ایک منظم جماعت کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان ایک ایسی جماعت پیدا نہیں کر سکتا یا اس کے رونما کرنے میں ممد و معاون نہیں ہو سکتا تو وہ عملاً خدا کی توحید اور ختم رسالت کی تکذیب کر رہا ہے اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔

۲۰۔ یہ جماعت کس طرح قائم ہوتی ہے

اوپر یہ چیز کھول کر بیان ہو چکی ہے کہ اسلام چند بے حقیقت۔ سطحی اور رسمی عقاید کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک اٹل۔ ہمہ گیر۔ اجتماعی ضابطہ حیات Code of Life ہے جو زندگی کے ہر پہلو بلکہ ہر سانس پر حاوی ہے جماعت کے بغیر اسلام اسلام نہیں ہے لا اسلام الا بالجماعۃ (عمرؓ) جس جماعت کے بغیر اسلام زندہ نہیں رہتا۔ اس کی ہیئت ترکیبی اوپر کے صفحات میں واضح کی جا چکی ہے۔ اب ذرا عمیق نظر سے اس چیز کو دیکھنا ہے کہ یہ جماعت کیونکر قائم ہوتی ہے اور کس طرح زندہ رہتی ہے۔

مسلمانوں سے کہا گیا ہے :-

یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ و لا تموتن الا وانتم مسلمون ۵ واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا و لا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً

فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً وکنتم علیٰ شفا حفرۃٍ من النار فانقذکم منھا کذلک یبین اللہ لکم اٰیٰتہ لعلکم تھتدون ۝

(مفہوم) اے ایمان والو اللہ سے پوری پوری طرح ڈرو اور مرنے سے پہلے پوری پوری طرح اس کے اطاعت گزار ہو جاؤ (اس کی شکل یہ ہے) کہ اللہ کی رسی مل کر مضبوطی سے پکڑو اور ٹکڑے ٹکڑے مت ہو۔ یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو کہ جب تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور تم بفضل خدا بھائی بھائی بن گئے عین اس حالت میں کہ تم جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے اس نے تم کو بچا لیا اللہ تمہارے فائدہ کے لئے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے کہ تم راہ راست پر قائم رہو۔

یہ درخشندہ آیت اپنی تفسیر آپ ہے۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں یا ایھا الذین اٰمنوا کہہ کر خطاب کیا ہے کچھ اوامر ہیں اور کچھ نواہی۔ یہی سب مل کر مومن کی صحیح تعریف بنتے ہیں۔ ان آیات سے واضح ہے کہ من جملہ اور باتوں کے مومن وہی ہے :-

(۱) جو صرف اللہ ہی سے ڈرے (حق تقاتہ) ——— یعنی

(۲) اس کا پورا پورا اطاعت گزار ہو ——— یعنی

(۳) اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ——— یعنی

(۴) گروہوں میں نہ بٹے اور تفرقہ سے نہ کٹے۔

ان زندگی بخش احکامات پر عزم وتسکین کے ساتھ ثابت قدم رکھنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو وہ سماں یاد دلایا ہے جب انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے فرزندانِ آدم کے پیدائشی حقوق ضبط ہو رہے تھے۔ دلوں میں بغض وحسد کے جہنم دہک رہے تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہی درجۂ انسانیت سے گرے ہوئے انسانوں کو اللہ کے لطف وکرم نے نواز کر باہم شیر وشکر کیا۔ اس ساری تبیین وتوضیح سے قرآن اس چیز کو واشگاف طور پر سامنے لانا چاہتا ہے کہ اس صراط مستقیم پر مومن قائم نہیں رہیں گے تو پھر وہی دہکتا ہوا جہنم ہے جس کے کنارے وہ قبل اسلام پہنچ چکے تھے۔

آیۂ یاایہا الذین آمنوا.......الخ۔ سے جو چار نتائج اخذ کر کے اوپر رکھے گئے ہیں اُن پر غور کیجئے۔ معلوم ہوگا کہ (۱) خوف خدا (۲) اس کی مکمل اطاعت (۳) اور متحد ہوکر رہنا تینوں چیزوں کا مدار اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے یعنی اعتصام بحبل اللہ پر ہے۔ یہ اعتصام کیا ہے۔ اس کی تفصیل اُن اوامر ونواہی کی عملی پابندی ہے جن پر کتاب اللہ مشتمل ہے مگر اس کا مختصر فارمولا Formula بھی پیش کر دیا گیا کہ کوئی اشکال۔ کوئی پیچیدگی اور کوئی حیلہ نظام ملت سے الگ رہنے کے لئے کارگر نہ ہوسکے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

یاایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اس صاحب امر کی جو تم میں سے ہو۔

اوپر جس مسلک زریں کا ذکر ہوا ہے اس کی تین کڑیاں اللہ۔ رسول۔ اور اللہ و رسول کا قائم مقام امیر ہے۔ ان میں سے ایک بھی کڑی غائب ہو تو اللہ کی وہ رسی جس کو مضبوطی سے پکڑے بغیر ایمان ایمان ہی نہیں رہتا۔ باقی نہیں رہتی یہی راز ہے جس کو سمجھ لینے یا نہ سمجھ سکنے پر ملت کی موت و حیات کا دار و مدار ہے۔ صدر اول کے مسلمان جن کے قلوب پر آفتاب نبوت نے اپنی اولین شعاعیں ڈالی تھیں اس راز کو سمجھ چکے تھے۔ یہ یقین ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا اور نگاہوں میں نور بن کر چمکتا تھا کہ اسلام اعتصام بحبل اللہ ہے اور اعتصام بحبل اللہ جماعتی زندگی اور جماعتی زندگی امیر کی مکمل اطاعت ہے۔

باب سوم

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکارِ بے نظامِ او چہ گویم؟
تو می دانی کہ ملّت بے امام است!!

(اقبال رحم)

بحث یہاں آکر ختم ہوئی ہے کہ اسلام جس جماعت کے پیدا کرنے اور زندہ رکھنے کے درپے ہے اُس کا دارومدار اعتصام بحبل اللہ پر ہے۔ پھر عرض کیا گیا ہے کہ اس اجمال کی تفصیل اُن اوامر و نواھی کی پابندی ہے جن پر قرآن کریم مشتمل ہے اور اس کا مختصر سا گر Formula ہے

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم ط

(ترجمہ) "اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اس صاحب امر کی جو تم میں سے یعنی ایمان لانے والوں میں سے ہو"۔

اطاعت امیر

ان توضیحات سے یہ تو واضح ہو گئی کہ جماعت کے قیام و بقا کے لئے اعتصام بحبل اللہ ضروری ہے اور یہ اعتصام ان اوامر و نواھی کی اجتماعی پابندی ہے جن سے اسلام کا ضابطہ متشکل ہے مگر اب سوال یہ ہے کہ اس پابندی کی عملی شکل ہے کیا؟ جس اللہ کی رسی سے اعتصام کی شدید تاکید کی جا رہی ہے اور جس میں انسانیت کی اجتماعی حیات کا راز ہے اس کو کس طرح مضبوطی سے پکڑا جا سکتا ہے ؟ خدا کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ سن نہیں سکتے۔ محسوس نہیں کر سکتے۔ اس کی ذات ہماری خبر و نظر کے حیطوں سے آزاد اور وراء الوری ہے۔ تو پھر ایسی ان دیکھی اور ان بوجھی "ہستی" کی اطاعت یعنی چہ؟ یہاں وجود باریؐ کی بحث اصل موضوع سے دور جا پڑتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی لئے خطاب صرف اُنہی لوگوں سے کیا ہے جو ہر قسم کے ریب و تردد سے پاک اور بلند ہو کر علی وجہ البصیرت اُس ذات یکتا و بے ہمتا پر ایمان لا چکے ہیں۔ یہ تخصیص تخاطب محض اس لئے ہے کہ جو جماعت پیدا کرنی مقصود ہے اس کا قصر رفیع اُنہی قلوب کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے جن کا ایمان حق الیقین اور عین الیقین کے درجہ تک پختہ ہو چکا ہے۔ اہل ایمان کی اس جماعت کو کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرے اور وہ اس طرح کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی اطاعت کرے

انسانیت کی نمود سے لے کر آخر تک انبیائے کرام علیہم الصّلوٰۃ والسّلام اس لئے ہی آتے رہے کہ انسانوں سے خدا کی اطاعت کرا سکیں۔ انسانوں کی طرف سے انسانوں ہی کو اس لئے رسول بنا کر بھیجا جاتا رہا ہے کہ غیر محسوس اور غیر مشہود خدا کی اطاعت نہ کرنے کے لئے کوئی عذر اور کوئی حیلہ باقی نہ رہے چونکہ رسول منصب رسالت کی جہت سے جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ بلکہ عین منشائے الٰہی اور وحی خدا ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت کی تشکل اس کے بھیجے ہوئے رسول کی اطاعت قرار پاتی ہے۔ رسول کی اطاعت سے انکار خدا کی خدائی سے بغاوت ہے۔ رسول آتا ہی اس لئے ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

وما ارسلنا من رسولٍ الّا لیُطاع باذن اللہ ط

ترجمہ:" ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس مقصد کے ساتھ کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے "

انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے انسانوں کو رسول بنا کر بھیجنے کو اللہ نے ایک بہت بڑا احسان اور انعام قرار دیا ہے۔ ذرا غور فرمائیے اگر ہماری ہدایت کے لئے کوئی جن یا فرشتہ تجویز کر دیا جاتا تو اللہ اس پر بھی قادر تھا۔ ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر ط مگر وہ تو لوگوں کے لئے شفیق اور مہربان ہے ان اللہ بالناس لرؤف الرحیم ہ انسانوں ہی میں بعض برگزیدہ ہستیوں کو رسول بنا کر اور پھر ان ہی میں سے خاتم النبیین اور صاحب

لو لاک نبیؐ کو اُٹھا کر اس نے :-

(۱) انسانیت کے مرتبہ کو بلند سے بلند تر کر دیا۔ (۲) اپنے رسولوں کو اپنے بھیجے ہوئے ضابطہ کا مکمل اور احسن ترین نمونہ بنا کر دوسروں کے لئے اس ضابطہ کی پابندی آسان کر دی (۳) اس سارے انعام واکرام سے متمتع اندوز ہو کر انسان کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ ایک محسوس مشہود اور ناطق پیکر کی مثال سامنے رکھ کر نیابت الٰہی کے اس پروگرام پر عمل پیرا ہو سکے جس کے صلے میں وہ فرشتوں سے بھی بلند مرتبت ہے۔

ان ساری حقیقتوں کو یوں بیان کیا گیا:۔ لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ——— الخ

یقیناً اللہ نے مومنوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ اُن کے لئے اُنہیں میں سے اپنا رسول پیدا کیا جو ان کو اس کی نشانیاں بتلاتا ہے۔ ان کی تہذیب و نفس اور تطہیر کرتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے۔"

غرضیکہ آغاز کار سے اللہ نے اپنی اطاعت کی شکل یہی رکھی ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی اطاعت کی جائے۔ مگر باوجود اس شرف و اختصاص کے جو تمام رسولوں سے بڑھ کر نبی کریمؐ کو حاصل تھا اور جس تک مخلوقات میں سے کسی کی رسائی نہ ہوئی ہے نہ ہوگی جملہ انبیائے کرامؑ اور آنحضورؐ موت و حیات کے اُسی قانون کے پابند تھے جو عام انسانوں کے لئے ہے۔ اور

وہ قانون ہے کُلّ نفسٍ ذائقۃ الموت۔ یا۔ کُلّ من علیہا فانٍ
چنانچہ سرورِ کائنات کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔
ما محمد الا رسول۔ قد خلت من قبلہ الرُّسل ط افائن مات
او قتل انقلبتم علےٰ اعقابکم ط ومن ینقلب علےٰ عقبیہ فلن
یّضر اللہ شیئاً ہ یہ آیت اگرچہ غزوۂ اُحد کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی
مگر اس کی شانِ نزول سے قطع نظر اس میں ایک اٹل اور ابدی حقیقت ہے،
جس کی طرف توجہ دلانا مقصودِ اصلی ہے۔ اس کو کما حقہٗ سمجھ لینے سے یہ چیز
ذہن میں آجائے گی کہ اللہ کی اطاعت تو ایک محسوس مشہود اور ناطق پیکر
یعنی رسول کی بالمشافہ اطاعت سے اس کی زندگی میں ہو گئی۔ مگر رسول
کے بعد اللہ کی اطاعت کی کیا صورت ہے اور خود رسول کی اطاعت جو خدا
کی اطاعت کا دوسرا نام ہے کیونکر ممکن ہے۔ آیت زیرِ غور میں مسلمانوں
سے کہا جا رہا ہے کہ "محمد تو صرف اللہ کا رسول ہے۔ یقین جانو کہ اُس سے
پیشتر بھی رسول آئے اور تشریف لے گئے۔ (اسی طرح وہ بھی) انتقال فرما
جائیں یا (فرض کرو) قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (اپنی کفر کی حالت کی
طرف) مڑ جاؤ گے؟" اُحد کے جاں نثاروں نے اس کا جواب نفی میں دیا تھا
لیکن یہ سوال پوچھنے والا خدا ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے کہ رسول کے پیکر کی
پرستش کرنے والے اگر اس کے بعد مڑ بھی جائیں تو وہ "اللہ کو ذرہ بھر
بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے"۔ اِس آیت کریمہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ رسول
کے بعد بھی اللہ کے آخری ضابطہ کی پابندی اور اطاعت کا وہی انداز مطلوب ہے

جو رسول کی موجودگی میں اختیار کیا گیا تھا۔

آدم سے لے کر محمد مصطفےٰ صلعم تک تمام انبیاء و رسلؑ مات او قتل کے ماتحت اس دنیا سے تشریف لے جا چکے۔ جب تک وہ یکے بعد دیگرے اپنی اپنی اُمتوں میں موجود رہے اپنی اطاعت جو دراصل خدا کی اطاعت تھی بحیثیت زندہ اور ناطق امیر کے لوگوں سے کراتے رہے۔ اُن کے متبعین ایک شیرازہ میں بندھے رہے۔ مگر اب کہ رسولوں کی تشریف آوری کا سلسلہ رسول اکرم پر ختم ہو چکا ہے اور حضور پر نور بھی اپنا مشن سرانجام دے کر جہاں آب و گل سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اس اعتصام بحبل اللہ کی کیا شکل ہے جو ایمان کی ایک اہم اور لازمی شرط بلکہ عملی گواہی ہے۔

قرآن کریم نے جو تمام زمانوں اور تمام زمانوں کی تمام اُمتوں کی حیات کا آخری اور قطعی لائحہ عمل ہے اللہ اور رسول کے بعد اُن کے نمائندہ کے طور پر اُس اولی الامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے جو "یا ایھا الذین آمنوا ...... منکم" ہو۔ جب تک اُمت میں رسول کریم بنفس نفیس موجود رہے۔ بالمشافہ حکموں کی اطاعت ہوتی رہی اُمت ایک شیرازہ میں بندھی اور ایک رشتے میں پروئی رہی لیکن اسلام کا سیل سبک سیر و جہانگیر زمان و مکان کی قیود توڑ کر بڑھنے۔ پھیلنے پھولنے اور پھلنے والی طاقت تھی۔ اس لئے اُن امصار و دیار میں جہاں رسولؐ کی زندگی ہی میں اسلام پہنچ چکا تھا۔ اُس اولی الامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا گیا تھا جو اللہ اور رسول کے لئے اپنی اطاعت

لوگوں سے کرا سکے اور رسول کے بعد بھی اہتمام ابد الآباد تک ملت کی شیرازہ بندی کا کفیل بنایا گیا۔

۲۲۔ اُولی الامر منکم کی عظیم الشان حکمت

خدا اور رسول کے بعد "اولی الامر منکم" کو ملت کی تمام توجہات کا مرکز اور احکامات کا منبع بنا کر اسلام نے اپنے پیروؤں پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اس کا شکریہ کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اسلام سے قبل اور آج بھی غیر مسلم اقوام ہیں۔ ملوک و سلاطین امراء وزراء اور دیگر اکابر و زعماء اپنی اپنی قوم کی تقدیروں کے مالک اور ان کے رہنما ہیں۔ مگر جو بلند اور مقدس مرتبہ خدا اور رسول کے جانشین کا ہو سکتا ہے اُس کو کچھ قرآن کی حامل اُمت ہی سمجھ سکتی ہے۔ قوموں کی زندگی اور زندگی کی آبرو کا دار و مدار ہمیشہ اس کے قومی اور اجتماعی نصب العین پر ہوتا ہے۔ جو قوم جس قدر بلند۔ پاکیزہ اور بے لوث مقصد حیات رکھتی ہوگی اس کا اخلاق۔ اُس کی سیرت اُس کا جاہ و جلال اور اس کی عظمت بھی اُسی نسبت سے بے مثل اور شاندار ہوگی اُس قوم کی نجابت و شرافت کا کیا کہنا جس کا فریضۂ حیات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ جس کی آخری منزل اللہ کی حکومت قائم کرنا ہو جس کی زندگی کی راہ انسانیت کی خدمت اور نگرانی ہو یہ بلند اور ارجمند مقصد زیست کہاں سے آیا؟ اس کا سرچشمہ وہی ذات احد ہے جو

فاطر السمٰوٰت والارض ہے۔ یہ ذروۂ عالیہ اُسی وقت تک نصیب رہتا ہے جب تک نگاہیں اُسی ذات بلند کی طرف لگی رہتی ہیں۔ جوں ہی نگاہ اُس طرف سے ہٹتی ہے بلندی پستی سے اور فراز نشیب سے بدل جاتا ہے اس بلند مقام پر استقلال و دوام سے فائز رہنا۔ صرف ایک ہی طرح ممکن ہے اور وہ یوں کہ اُمت کا سلسلہ رسول سے اور رسول کے ذریعہ خدا سے ملا رہے۔ مگر جیسا کہ چند سطور اوپر عرض ہو چکا رسول سے واسطہ قائم رکھنے کا قرآنی طریقہ اولی الامر منکم کے بغیر نہ صرف محال بلکہ ناممکن ہے۔ رسولؐ سے بڑھ کر کتاب اللہ کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونے کا دعویٰ اور کون کر سکتا ہے۔ اسی رسول گرامی منزلتؐ نے آیۂ اولی الامر کی تشریح و توضیح میں جس شد و مد سے قیام امارت اور اطاعت امیر کی تاکید فرمائی ہے وہ ابھی گراں مایہ اسرار و رموز کے مدنظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول کے بعد مسلمان کو مسلمان رکھنا بغیر ایک جماعت۔ ایک مرکز اور اس جماعت و مرکز کے پاسباں امیر کے ممکن ہی نہیں۔ یہی شخصیت ہے جو ملت کی اُمیدوں تمناؤں۔ توجہات اور مساعی کے لئے نقطۂ ماسکہ بن سکتی ہے۔ اگر یہی نہ ہو تو ملت کی مثال تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ انّ فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون ۝

۲۳۔ اُولِی الاَمر کا قرآنی مفہوم

اولی الامر کے مفہوم کے بارے میں علمائے عظام اور فقہائے کرام میں اختلاف ہے۔ یہ حسرت آفریں حقیقت تلخ ہے۔ مگر اس کا اظہار کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہی اختلاف بڑھتے بڑھتے آج ملت کے انتشار کا باعث بن چکا ہے۔ علمائے سلف نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ اور اپنے اپنے تفقّہ کے مطابق مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور فرما کر جو نتائج اُمت کے سامنے نہایت ہی نیک نیتی سے رکھے تھے۔ اخلاف نے اُن کو بدلے ہوئے حالات اور منقلب فطرتوں کے مطابق وہ عجیب و غریب رنگ دے بیٹھے ہیں کہ آج الحقائق حق اور البطال باطل بھی الحاد و زندقہ میں شمار ہونے لگا ہے۔ آہ! اسے

یہ اُمت روایات میں کھو گئی

حقیقت خرافات میں کھو گئی!

اسلاف کرام کے یہ اختلافات محض اجتہادی نوعیت رکھتے ہیں مگر وا اسفا! کہ چند صدیوں کے مرور نے ان پر خوش عقیدگی کے وہ نظر فریب غلاف چڑھا دئے کہ آج ان پر خود قرآن کریم ہی کی روشنی میں نظر ثانی کرنا کفر ٹھیرایا جا رہا ہے! حالانکہ ان اختلافات کی اسپرٹ قطعاً تفریق و انتشار کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ابن عباس۔ جابر بن عبد۔ حسن بصری۔ عطار ابو العالیہ۔ امام مالک۔ امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے نزدیک

اولی الامر سے مراد علمائے شریعت اور مجتہدین فقہ ہیں۔ دیگر محققین جن میں تقریباً اسی پائے کی ہستیاں شامل ہیں۔ اس سے مراد حکام و سلاطین لیتے ہیں۔

اگر اس اختلاف اور اس سے پیدا شدہ نتائج پر غور کیا جائے تو ایک دردناک حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے صدر اول کے بعد اکثر و بیشتر مسلمانوں نے بھی اپنے دین کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دوسری مردہ اور مرنے والی اُمتوں نے کیا تھا۔ اور کرتی رہتی ہیں۔ وہ یہ کہ دین و سلطنت کو عملاً علیحدہ علیحدہ حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دونوں میں مغائرت بڑھتے بڑھتے خصومت کا رنگ اختیار کر گئی۔ دین کے پیشوا جدا ہو گئے اور حکومت نے ان سے پیچھا چھڑایا۔ "برہمنیت" اور "ملوکیت" کے شکستہ بتوں کے ٹکڑوں کو فراہم کر کے پھر جوڑ لیا گیا۔ دونوں طرف رقابت اور تفوق کی جنگ شروع ہو گئی۔ "دین سلطنت کا غلام ہے"۔ "سلطنت دین کی کنیز ہے"۔ یہ دو خطرناک فیصلے تھے جن پر رفتہ رفتہ اُمت کو پہنچا کر اجتماعی حیات کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے مسکینی و دلگیری۔ جمود و تعطّل اور خواب آلود "پاکبازی" کا نام دین قرار پایا۔ جور و تعدّی اور ملوکانہ ٹھاٹھ کو "سلطنت" ٹھیرایا گیا! وہ قرآن مجید جو سلطنت و حکومت اور تقویٰ و دینداری کے جمیل ترین مجموعہ کا ضابطہ تھا۔ دونوں گروہوں کی نفسانی آرائی کی نذر ہو کر رہ گیا۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون ہ

مگر قرآن جو ہر دور اور ہر اُمت کے لئے چراغ ہدایت ہے۔ ان تمام

عقیدت سوز مناظروں اور مباحثوں کی زندہ اور دائمی تردید ہے۔ اولی الامر کے صاف اور سیدھے معنی صاحب امر یعنی حکم کرنے والے کے ہیں اور حکم کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعمیل ہو ورنہ حکم صحیح معنوں میں حکم نہیں ہوتا۔ اور یہ تعمیل اسی شکل میں ممکن ہے کہ تعمیل کرانے والی قوت موجود ہو۔ یہی قوت ہے جس کو سیاسی زبان میں حکومت و سلطنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہے اپنے اولی الامر کا ایک پہلو۔ اب دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ حقیقت خود بخود صاف ہو جاتی ہے۔ قرآن کا یہ ناقابل انکار معجزہ ہے کہ متلاشی حق طبیعت کے لئے اسکی آیات اور مطالب میں کوئی اشکال کوئی پیچیدگی نہیں۔ آیت زیر بحث میں خطاب ہے یا ایھا الذین آمنوا سے اور اولی الامر جس کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا وہ اسی ایمان لانے والے گروہ ہی کا ایک فرد ہے۔ ایمان لانے والوں کی تعریف Definition قرآن کے قریباً ہر صفحے پر مختلف انداز میں موجود ہے۔ دونوں پہلوؤں کو ملا کر دیکھئے تو یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سیاسی اور شرعی امارت میں تفریق نہ صرف نا ممکن بلکہ آیت کی روح کو مجروح کرنے والی ہے۔ کسی آیت سے استدلال کر کے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں چیزوں میں کوئی بُعد ہے۔ زیادہ سے زیادہ اور وہ بھی نہایت محتاط پیرائے میں With Reservations یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو چیزیں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور بس! جتنا زیادہ قرآن مجید۔ احادیث رسول۔ اُسوۂ نبویؐ اور آثار صحابہؓ پر غور کیجئے گا۔

یہ حقیقت ثانیہ زیادہ سے زیادہ تابندہ ہو کر سامنے آئے گی کہ شریعت کو حکومت و سلطنت کے لئے دلیل راہ اور حکومت و سلطنت کو شریعت کی محافظ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی خصوصی امتیاز ہے جس کا دعویٰ اسلام کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سے

ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند!

شروع سے لے کر آخر تک دیکھ جائیے سلطنت و نبوت کا چولی دامن کا ساتھ نظر آئے گا۔ اس لئے کہ سے

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد!

اسلام میں یہ تصور ہی باطل ہے کہ شریعت بغیر اقتدار کے زندہ رہ سکتی ہے یا حکومت بغیر شریعت کے چل سکتی ہے۔ اسلام یہ فرض بھی نہیں کر سکتا کہ "بے دین سیاست" اور "غیر سیاسی مذہب" بھی کوئی چیز ہے۔ آیۂ یا ایھا الذین آمنوا .... منکم نے اس بحث کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ملت کا امیر وہی ہے جو "منکم" ہو اور منکم وہی ہے جو اولی الامر یعنی حکم دینے اور منوانے کے قابل ......

اور اطیعو اللہ اور اطیعو الرسول کا پابند ہو ——————

انہ لقول فصل وما ھو بالھزل۔

۲۴- ایک لطیف نکتہ

یہی آیت جس کا زندگی بخش ذکر ہو رہا ہے۔ آزادی و حریت کا ایک مستقل پیغام ہے۔ ایمان والوں کو ایک لطیف پیرائے میں سمجھایا جا رہا ہے کہ غلامی کی زندگی میں تمہاری اطاعت اللہ اور اطاعت رسول صحیح معنوں میں اطاعت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ اطاعت کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے ایک امام اور ایک امیر جو ملت کے تمام امور اور قویٰ کا شیرازہ بند ہو سکتا ہے اور پھر امیر بھی ایسا امیر جو رفتار میں گفتار میں۔ سیرت میں کردار میں غرضیکہ زندگی کے کسی پہلو میں بھی کسی غیر الٰہی قوت کا غلام یا زیر اثر نہ ہو۔ جہاں کہیں اور جب کبھی امیر کی یہ شان اُس سے جدا ہوئی وہ صحیح معنوں میں " ایمان لانے والے " اگر وہ میں سے نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کا امیر نہیں ہو سکتا۔ قطع نظر امیر کی شخصیت کے یہ سرگونہ اطاعت تو اس لئے تھی کہ مسلمان دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کر سکے۔ مگر جب خود اس نے بجائے اللہ کی حکومت قائم کرنے کے۔ کسی فرعون۔ کسی شدّاد۔ کسی "لات" یا کسی "ہبل" کی بندگی میں جینا قبول کر لیا تو 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور جب وہ اس دوگونہ پروگرام پر آزادیٔ عمل کے قابل نہیں تو خلافت الٰہی کا قیام تو بہت بعد کی چیز ہے۔

خلاصہ ان گزارشات کا یہ ہے کہ مومنوں پر اللہ اور رسول کی اطاعت فرض

ہے۔ رسول کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یہ اطاعت امیر کی اطاعت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ افراد کی اطاعت اللہ اور اطاعت رسول اپنی جگہ پر افراد کی نجات کے لئے کافی سہی۔ مگر اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ افراد امت اپنے اجتماعی فریضۂ حیات سے غفلت برت کر اُمت کو اس عذاب الیم سے نہیں بچا سکتے جو ہر خود فراموش اور خدا فراموش قوم کے لئے مقدر ہو چکا ہے جب پوری کی پوری اُمت تباہی و بربادی کے جہنم یعنی غلامی کی لپیٹ اور انتشار کے شکنجے میں کسی گئی تو افراد کی "نیکی" اور "پرہیزگاری" کہاں باقی رہ گئی اور اسلام کے کیا کام آئی لہٰذا رسول کے بعد اُمت کی اجتماعی اطاعت کو قائم رکھنے کا ذریعہ صرف امیر ہے اور چونکہ یہ اطاعت ایک نیا نظام ایک نئی دنیا اور ایک نیا جہان پیدا کرنے کے لئے ہے۔ بغیر مطیع اور مطاع کی مکمل آزادی کے ممکن ہی نہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ہندی مسلمانوں کی اولیں توجہ کا مستحق ہے۔ وہ غور کریں کہ جب ان کی زندگی کی ایک ایک سانس پر غیر الٰہی قوتوں کا ہول طاری ہے۔ اُن کا دعوئے دین و دانش خود فریبی اور خدا فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر آہ! جب مسلمان سے حکومت و سلطنت چھین گئی تو بجائے اس کے کہ وہ اس ثمر ایمان (انتم الاعلون ان کنتم مومنین) کو دوبارہ حاصل کرنے کی سعی کرتا اُس نے وہ تمام امور جو ایک زندہ اور آزاد ملت کی عظمت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ایک ایک کر کے اپنی جہالت سے

ص۱ غیر اللہ کے قانون کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہوئے افراد کی اطاعت "سجدے کی اجازت" سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔ مصنف

خارج کر دیئے جو کچھ باقی رہ گیا۔ اس میں بھی چند لایعنی اور طائل جھمیلوں کو "سیاست" کا نام دیکر علیحدہ کر دیا اور بقیہ کو "دین" کا نام دے کر اعتکاف کے گوشوں۔ خانقاہوں۔ تکیوں۔ مسجدوں۔ اور قوالی کی محفلوں میں مقفل کر دیا ؎

در غلامی عشق و مذہب را فراق   انگبین زندگانی بد مذاق
در غلامی عشق جز گفتار نیست   کار ما گفتار ما را یار نیست
دین و دانش را غلام ارزاں دہد   تا بدن را زندہ دارد جاں دہد
گرچہ بر لبہائے او نام خدا ست
قبلۂ او طاقت فرماں رواست   (اقبال رح)

یہ تصویر کا وہ رخ ہے جس میں وزارتوں۔ امارتوں خطابوں۔ مرتبوں اور طروّں کا عشق چھلکتا نظر آئے گا۔ غلامانہ زندگی کا دوسرا رُخ اس سے بھی زیادہ دردناک اور بھیانک ہے اور رونے کا مقام یہ ہے کہ جن لوگوں کی سیرت کے پہلو سے یہ رُخ تیار ہوتا ہے وہ بڑے بڑے "قبلہ و کعبہ" فی کلم عاملان شریعت اور وارثین منبر و محراب ہیں۔ وہ جن کو قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی میں سوائے گاندھی بھگتی اور وطن پرستی کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا ستم بالائے ستم ملاحظہ ہو کہ دین محمد (روحی فداہ) کے ساتھ یہ چیرہ دستی "متحدہ قومیت" اور حب مآبی کے نام پر ہے! افسوس ؎

از غلامی بزم ملت فرد فرد   این و آں با این و آں اندر نبرد
از غلامی مرد حق زنار بند   از غلامی گوہرش نا ارجمند

۲۵۔ قرآن کے ساتھ مسلمانوں کا کھیل

وہ مسلمان جس کو حضرت یزداں رحمت فراواں نے رحمۃ اللعٰلمین اور خاتم النبیین نبی کی اُمت بنا کر خاتم اقوام اور خیر امم ہونے کا مرتبہ عطا کیا تھا۔ جس کو اپنے آخری اور عظیم ترین پیغام کے حامل ہونے کا شرف بخشا تھا اس نے بتدریج اس حقیقت کو فراموش کر دیا۔ کہ وہ دنیا میں اللہ کا نام بلند کر کے خود بلند اور ارجمند رہنے کے لیئے ہے۔ اللہ کا نام بلند کرنے کا فریضہ جو مسلمانوں پر مولائے یثرب کے لطف و کرم کے طفیل عائد ہوا تھا اس نے ترک کر دیا اذکروا اللہ یذکرکم کی جاں بخش نوید کے باوجود۔ ان تنصر اللہ ینصرکم کی تائید کے باوصف اور ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم کی وعید کو سنتے ہوئے اس نے اللہ کو بھلایا۔ رسول کو بھلایا اور قرآن کو بھلایا! نہیں بلکہ اس نے اپنے عمل سے اللہ کی تکذیب کی۔ رسول کی (نعوذ باللہ) تردید۔ قرآن کی تغلیط کی اور نتیجہ کے طور پر اپنی عظیم الشان ملت کی تخریب کر ڈالی۔ جب اس نے یہ سب کچھ کر دیا تو اللہ کے اٹل قانون نے بھی اس کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے۔ وہی ہندوستان جس میں اس نے ایک ہزار برس تک کوس لمن الملک بجایا تھا بے تخت و تاج اور اپنی گھٹیا سی گھٹیا احتیاج کے لیئے اپنی پرانی غلام اور دنیا کی ٹھکرائی ہوئی قوم کا غلام بن کر رہ گیا۔

اس کا ملّی نظام پارہ پارہ اور اس کا قومی کیریکٹر ریزہ ریزہ ہوگیا یہاں تک کہ اس کے ذہن و خیال سے بھی یہ حقیقت رخصت ہی ہوگئی کہ وہ کیا تھا۔ غلامانہ بیچارگی اور مجبوری کی میٹھی نیند اس پر اتنی غالب ہوئی کہ ذلت و رسوائی میں لذّت محسوس کرنے لگا اور اس حد تک کہ اس نے اسی بے دست و پائی، اسی جبیں سائی اور آہ! اسی بے حیائی کو اصل دین و دانش قرار دے لیا ؎

حسنِ آلسمہ از نگہش شد نہاں
وا ز دل و جانش قبول کرد پیام فرنگ!
بندگیٔ غیر را گفت ترقی خویش
کم نظر و کم سواد صید بدام فرنگ!!

بجائے اسکے کہ اس دل افگن اور ہوش ربا ظلمت میں قرآن کے نور مبین کو دلیل راہ بناتا اس نے اس بزدلانی تجلّی کو اپنی منشا کے مطابق جس رنگ کے شیشے میں چاہا اتارا اور اپنی زندگی کو جو رنگ چاہا دیا۔ جس آقا کے طفیل قرآن خاتم الکتب اور اس کے حامل خاتم الامم ہیں اسی آقا کی ختم المرسلین کو (خاکم بدہن) ختم کر دینے کی سعی کی گئی، جہاں غلامی کے آسمان سے جہاد کو حرام قرار دینے والا "الہام" نازل ہوا وہاں دجل و تلبیس کی ناپاک فضا سے یہ شوشا بھی چھوٹا کہ آیۃ۔ "یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اولی الامر منکم" میں منکم سے مراد ملک کی فرماں روا طاقت ہے ؎

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارتِ گرا قوام ہے یہ صورتِ چنگیز (اقبالؒ)

۲۶۔ مشروط اور غیر مشروط اطاعت امیر کی بحث

اور یہ جن کو نہ آستینوں کی دراز دستیوں کا رونا رو یا گیا ہے ان کی "دلنواز تلمیع" کے نیچے کمند صاف نظر آ رہی ہے۔ حرم کے طائر لاہوتی کی تیز نظر دیکھ رہی ہے کہ یہ سارا سامان دجل و تلبیس اس کو ابدی طور پر تہِ دام رکھنے کے لئے ہے۔ مگر قیامت بالائے قیامت تو یہ ہے کہ ان غارتگرانِ دین و ملّت کو چھوڑ کر عام علماء کا گروہ بھی جو ملّت کی ہمدردی اور چارہ سازی کا مدعی ہے۔ لفظی نزاع۔ ہنگامہ آرائی۔ بحث و جدال اور "قال اقول" میں کھو کر اُمت کے مصائب میں اضافہ کر رہا ہے ؎

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کسی ایک کو توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ اللہ کی رسی کی تنیسری کڑی اولی الامر منکم کو پیدا کرنے کا سامان کر کے اُمت کا سلسلہ پھر خدا اور رسول سے ملا دے۔ چونکہ یہ کام ذرا مشکل ہے۔ ایک ہی امیر کو ملت کا سردار مان کر ملت کی بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹ دینے سے نام نہاد زہد و تقدس اور انفرادی امارتوں کے بت پاش پاش ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایک مدت دراز تک اس چیز پر ہنگامۂ رستخیز بپا رہا کہ اطاعت امیر مشروط ہے یا

غیر مشروط! اس تند و تیز اور ظلمت انگیز جھکڑ میں اصل مسئلہ یعنی "مرکزیت اسلام" کو نظروں سے اوجھل کر دیا گیا۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

حالانکہ یہ بدیہی امر ہے کہ مسلمانوں کا جو امیر بھی ہوگا یا ایہا الذین آمنوا کے مخاطب گروہ میں سے ہوگا۔ اور اس گروہ میں سے وہی ہو سکتا ہے جو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول پر صحیح معنوں میں پابند ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں تو تو۔ میں میں۔ اور بحث و تکرار کی گنجائش ہے کہاں؟ مگر اس کا کیا علاج کرے

در غلامی "دین" جز گفتار نیست

کوئی فرد جو "ابلیس کا مرید" "فسق و فجور کی دعوت دینے والا" یا "حرم پر مارچ کرنے والا ہو" مسلمانوں کے سامنے امیر بن کر آنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتا امت کی اس گئی گذری حالت میں بھی اتنا بڑا دھوکہ دن دھاڑے نہیں ہو سکتا کتاب اللہ اور اسوۂ رسول کی روشن قندیلیں موجود ہیں جو مطاع اور مطیع دونوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے رہی ہیں۔

۲۷۔ قرآنی زاویۂ نگاہ

جس نص قرآنی کی آڑ میں ہنگامۂ بحث وتکرار گرم کیا جاتا ہے وہ زیر فکر آیۂ اطاعت کا دوسرا حصّہ "اِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ" ہے۔ یعنی "اگر تمہارے اور تمہارے امیر کے درمیان کسی امر میں نزاع کی شکل پیدا ہو جائے تو اس امر کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو"۔ صرف و نحو میں اُلجھے بغیر اس آیت کا صاف اور سیدھا مطلب یہی ہے کہ مختلف فیہ مسائل اور امور کا تصفیہ صرف اللہ اور رسول کے احکامات کی روشنی ہی میں ہونا چاہیئے۔ یہی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت (ان کنتم تؤمنون باللہ) ہے۔ اسی بات میں نجات ہے (ذالک خیر) اور ایسے پیچیدہ مسائل میں یہی بہترین حل Best Interpretation ہے۔ (واحسن تاویلا)

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ بحث وجدال کے متوالوں کی تردید کا سامان ہر ہر مقام پر خود بخود ہو جاتا ہے۔ اگر صرف آیت یا ایھا الذین ..... واحسن تاویلا کو سباق و سباق سے بالکل علیحدہ کر کے بھی بنظر عمیق دیکھا جائے تو بھی التباس و اشتباہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ جو چیز آفتاب درخشاں سے بھی بڑھ کر درخشاں انداز میں سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ امیر کی اطاعت مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ ایک ذریعہ ہے ایک اونچے

اور الہامی مقصد کا اور وہ ہے اطاعتِ خدا اور اطاعتِ رسول۔ اس نکتہ کو واضح کرنے کے لئے قرآن نے اللہ اور رسول دونوں کیلئے اطیعوا کا لفظ استعمال کیا ہے مگر اُولی الامر منکم کو رسول سے و کے ذریعہ معطوف کر دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ امیر کی اطاعت مِن دُونِ اللہِ وَالرسول کوئی شئے نہیں بلکہ حقیقتاً لِلّٰہِ والرسول ہے۔ اگر بطور صریح اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واطیعوا اولی الامر منکم ہوتا تو شاید کھینچ تان کر کسی حیلے سے یہ کہنے کی گنجائش نکال لی جاتی کہ خدا اور رسول کے ساتھ ساتھ یعنی متوازی طور پر امیر کی اطاعت بھی اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ حالانکہ یہ شئے تجاوز عن الحد ہے۔ جس کی سند قرآن کی کسی آیت سے نہیں ملتی۔ اٹل اور ناقابل تردید مطلب یہی ہے کہ اطاعت صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس لئے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اور لا یُشْرِکُ فی حکمہ احداً۔ رسول کے لئے لفظ اطیعوا کی تصریح کا مطلب اس حقیقت کا اعادہ ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ سہ

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود
گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی۔ یہاں تک کہ اگر رسول بھی اپنی طرف سے کچھ (من گھڑت) باتیں کہے، تو اللہ کے سخت ترین مواخذہ اور عبرتناک ترین سرزنش کا مستوجب قرار پائے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيلِ (۴۵/۶۹) ۔ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ (۴۵/۶۹) ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ (۴۶/۶۹) فَمَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (۴۷/۶۹) ترجمہ ۔ اگر وہ (رسولؐ) بعض باتیں اپنی طرف سے ہماری جانب منسوب کرتا تو ہم مواخذۃً اس کا دایاں بازو پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے اور تم میں سے کوئی بھی اس کو بچانے والا نہ ہوتا۔"

ان تصریحات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری (اقبالؒ)

رسول کی اطاعت خدا کے لئے ہے اور امیر کی اطاعت رسول کی اطاعت کے لئے ہے جو خدا کی اطاعت سے الگ نہیں بلکہ حقیقتاً ایک چیز ہے۔ اسی لئے ما بہ الاختلاف امور میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کی تلقین کی گئی ہے۔ اُن لوگوں کو (اس میں مطیع اور مطاع دونوں شامل ہیں) جو ان واضح اور بین احکامات کی موجودگی میں اپنی کی سی ہانکے جائیں اور اللہ اور رسول کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں۔ طاغوت کے دامن میں پناہ لینے والے اور شیطان کے ہاتھوں میں کھیلنے والوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ اَنْ يَتَحَاكَمُوا اِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ اُمِرُوا اَنْ يَكْفُرُوا بِهٖ ۔ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۔ وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ

وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَءيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۚ
پھر ایک آیت بعد ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ
فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ
بَلِيْغًا ۝ ۶۳ ایک آیت چھوڑ کر قطعی طور پر فیصلہ کر دیا گیا کہ فَلَا وَرَبِّكَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴/۶۵)

(ترجمہ) (اے نبی) کیا آپ نے اُن کو نہیں دیکھا جو دعویٰ (تو یہ)
کرتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا اور آپ سے پہلے نازل ہوا
اس پر ایمان لائے اور حال یہ ہے کہ شیطان سے منصفی کرانا
چاہتے ہیں۔ حالانکہ اُن کو اس سے منکر ہو جانے کا حکم دیا جا
چکا ہے (۴/۶۰) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے
نازل کیا اس کی طرف اور رسول کے فیصلے کی طرف آؤ تو آپ
منافقوں کو دیکھیں گے کہ آپ سے اکڑ کر رہ جاتے ہیں (۴/۶۱)
یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کی بات کو جانتا ہے سو آپ
بھی اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیجئے اور اُن کو نصیحت کیجئے
اور اُن کو ایسی مؤثر بات کہیئے جو ان کے دلوں میں اُتر جائے ۶۳
(اے نبی) آپ کے رب کی قسم وہ اس وقت تک مومن ہو ہی
نہیں سکتے جب تک کہ آپ کو آپس کے جھگڑوں میں منصف نہ
بنائیں (اور) پھر اُن کے دل میں آپکے فیصلہ کے خلاف پیچ و تاب

پیدا نہ ہو اور اُس کو بطیب خاطر قبول کر لیں (۶۵:۴)
اس آیت مقدسہ سے ظاہر ہے اور اس میں مناظرہ بازی اور بحث آرائی کی گنجائش نہیں کہ تنازعہ کی صورت میں قرآن کریم کے صریح حکم اور رسولؐ اکرم کے فیصلوں کو تسلیم کیئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ یہی اصل دین و ایمان ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے وہ شیطان کا آلۂ کار اور سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

---

۳ - اُولی الامر کی اطاعت

محولہ بالا آیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سمجھنے اور غور کرنے کے قابل چیز یہ ہے کہ "تنازعتم" کی حدود کیا ہیں۔ اگر یہ حدود نظر کے ضبط میں آجائیں تو ہر دجل و تلبیس اور مکر و فریب کا پردہ چاک ہو سکتا ہے۔ اس باب کے شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ آیۂ یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنْكُمْ میں مخاطب ہی ان لوگوں کو کیا جا رہا ہے جو اللہ کی ذات پر بجمیع صفاتہٖ اور رسول خاتم النبیین کی رسالت پر بجمیع کمالاتہٖ ایمان رکھتے ہیں۔ خدا۔ رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا مطالبہ ہی ان لوگوں سے ہے جو دین قیم کے حلقے میں پوری طرح داخل ہو کر اپنی زندگیاں اسلامی ضابطۂ حیات کے قالب میں ڈھال چکے ہیں۔ اس حصار کے اندر جہاں تک

ایمان باللہ والرسول کا تعلق ہے "امیر" اور "مامور" دونوں یکساں طور پر مخاطب ہیں۔ مطیع اور مطاع دونوں ہیں جو سہ ایمان کو مسلم اور موجود Presupposed قرار دے کر اُن کو تلقین کی جا رہی ہے کہ اگر کسی موقع پر مسلمانوں اور ان کے امیر میں نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو وہ اس کے تصفیہ اور ارتفاع کے لئے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ یہ تلقین نہ صرف مسلمانوں کے لئے ہے اور نہ صرف اُن کے امیر کے لئے بلکہ دونوں کے لئے یکساں اور متوازی طریق پر ہے۔ اب یہ تنازعہ دو صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ یا تو اسکی نوعیت اصولی ہو گی یا فروعی۔ اصولی اس طرح کہ مثلاً امیر ایمان باللہ اور ایمان بالرسول اور اس دوگونہ ایمان کے قرآنی واجبات کے خلاف کوئی حکم دے یا ان میں سے کسی کا انکار یا کسی کی مخالفت اور بزور اقتدار ممانعت پر اُتر آئے اگر ایسی صورت حالات پیدا ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو اس گروہ مومنین سے الگ کر لیتا ہے جس کی طرف اس آیت کا خطاب ہے۔ وہ امارت مومنین کے مقام رفیع سے لازماً اور نتیجتاً Automatically گر جاتا ہے جس پر وہ بحیثیت "مومن" فائز تھا۔ لہٰذا نہ وہ امیر، امیر ہے نہ مومن اس کی اطاعت پر از روئے قرآن مجبور رہیں۔ اگر بنوک شمشیر وہ اپنی مستبد آمریت قائم رکھتا ہے تو وہ ظالم و جابر ہے جس کے خلاف جہاد ہی میں ملت کی نجات ہے۔ یہ تنازعہ کی انتہائی صورت ہے جس کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں لیکن اس سے بڑھ کر اگر وہ اس غیر اسلامی آمریت کو "عین اسلام" اور اصل دین کے رنگ میں مسلط کرنے کا سامان کرے تو اس کی امارت فتنہ ہے جو بزبانِ

قرآن قتل سے زیادہ برا اور شدید ہے۔ الفتنۃ اشد من القتل۔
اس لرزہ انگیز صورت کے مقابلے کی شکل قرآن نے ایک ہی بتلائی ہے اور
وہ ہے۔ فقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ
ایسی صورت حالات میں دین وملت بلکہ انسانیت کی فلاح اسی میں ہے
کہ اُس کے وجود نامسعود سے دنیا پاک ہوجائے۔ جب وہ منکم کے
دائرہ سے باہر ہوگیا تو اُس کی اطاعت اللہ اور رسول کے نام پر نہیں
ہوسکتی۔ بلکہ طاغوت کو حَکَم بنانے کے مترادف ہے۔ اسی قسم کی صورتیں
ہیں جن کا تفصیلی اور بیّن حکم زیر بحث ضمنی عنوان سے پہلے کی آیات میں
پیش کردیا گیا اگر اس جہت سے دیکھئے تو یہ کہنے میں قطعاً تامّل کی گنجائش
نہیں کہ امیر کی اطاعت مشروط ہے اور شرط اولین ہے۔ ایمان باللہ والرسول
یعنی بندۂ مومن کا امیر وہی ہے جو منکم کی قرآنی صفت سے متصف ہو
تنازعہ کی یہ اور اس سے ملتی جلتی صورتیں ہیں جن میں قرآن نے "ما انزل
اللہ ــــــــ والرسول" کی طرف رجوع کرنے کو دعوت دی ہے۔ بلکہ
یہی رجوع ہے جو نفاق وایمان کی کسوٹی بن جاتا ہے۔

لیکن جیسا کہ ایک مرتبہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، جو شخص دین وایمان
کی ردا کو اس بے باکی سے اتار پھینکے گا وہ مسلمانوں کا امیر بن کر مسلمانوں کے
سامنے آنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتا۔ جب تک وہ امیر ہے اس کی گردن
پر قرآن کی بے امان تلوار لٹکی ہوتی ہے۔ اسلامی امارت ایک ایسی "پل صراط"
ہے جو "تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے" امیر امارت کی

ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا کہ انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ چلنے پر مجبور رہے۔

اب تنازعہ کی دوسری شکل رہ جاتی ہے۔ اور وہ ہے فروعی اور سطحی اختلاف کی۔ یہ اختلاف کی وہ نوعیت ہے جو ہر زندہ ملت میں ہر لمحہ پیدا ہو سکتی ہے۔ جیسا تک قوم میں زندگی کا شعور اور حس موجود ہے جب تک اس کا اندیشہ جوہر حریت سے مالامال ہے۔ جب تک اس میں غور و فکر کی صحیح و صالح صلاحیتیں موجود ہیں۔ بعض مقامات اور بعض امور میں اختلاف آراء ناگزیر ہے۔ یہی اختلاف ہے جو مآل کار امت کی یکجہتی اور اجتماعی یک نگہی کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ لیکن یہ چیز کبھی اور کسی قیمت پہ فراموش نہیں ہونی چاہیئے کہ جہاں نیک نیتی کا اختلاف امت کے لئے برکت و رحمت ہے وہاں بددیانتی اور خود غرضی کا اختلاف لعنت اور لاعلاج زحمت بھی ہے یہ اختلاف رحمت ہے تو صرف اس حد تک کہ مختلف فیہ امر یا امور کے سارے پہلو بیک وقت سامنے آجائیں تاکہ ملت کے نصب العین اصلی یا وقتی اور ہنگامی مقصد تک پہنچنے کے لئے جتنی ممکن راہیں ہو سکتی ہیں اُن کے حسن و قبح اور نشیب و فراز کا جائزہ لیا جا سکے اور پھر ایک ایسی راہ چن لی جائے جو احسن ترین اور اقرب ترین ہو۔

افقِ مغرب سے طلوع ہونے والے علوم و فنون اور فرنگی سیاست نے جہاں انسانیت پہ اور بے شمار عذاب مسلط کئے ہیں وہاں ایک جمہوریت بھی ہے۔ مغربی نظریۂ جمہوریت پر تنقید موجودہ مقالہ کی وسعت سے باہر

ہے۔ سرِدست صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس کی تہ میں مساوات انسانی کا ایک نہایت ہی غلط اور غیر فطری نظریۂ مساوات کارفرما ہے۔ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے یقیناً "آدمیت احترام آدمی" ہے۔ بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔ لیکن افراد کے ماحول۔ ان کی تربیت۔ اُن کی استعداد اور صلاحیتوں میں فرق ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ جس سے انکار ممکن نہیں۔ یہی فرق ہے۔ جس کو مغربی سیاست کا تجاہلِ عارفانہ نظر انداز کر جاتا ہے۔ "جمہوریت" کے تاش کے گھروندے کی بنیاد اسی غلط نظریے پر ہے۔ جس کی رو سے دس افراد کی جماعت میں اگر نو خر نا شخص ہوں اور اُن میں انسان صرف ایک ہو تو نو خروں کی رائے ایک انسان کے مقابلے میں صرف اس لئے معتبر ہے کہ وہ نو ہیں۔ یہ ازمنۂ مظلمہ Dark Ages کی مستبد ملوکیت کا ردعمل Reaction ہے۔ مغربیت کے جس جس پہلو کو بھی دیکھئے گا اس میں یہی بے ہنگم افراط و تفریط نظر آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائی اور الہامی ضابطے کے بغیر زندگی کے کسی پہلو کو بھی نجات نصیب نہیں ہو سکتی اور انسان ایک نہ ایک چکر میں گرفتار رہنے پر مجبور ہے ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر (اقبالؒ)

یہاں جمہوریت کا ذکر جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے اس افراط و تفریط کے درمیان ایک عدل و توسط کی راہ قائم کی ہے۔ فروعی اختلافات کی صورتوں میں اسلام نے دو حدیں مقرر کر

دی ہیں۔ پہلی حد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام امور باہمی مشورت سے طے پائیں۔ امرھم شوریٰ بینھم۔ شوریٰ بینھم بین جمہوریت" کی جتنی خیر و برکت ہو سکتی ہے اپنے جمیل ترین رنگ میں موجود ہے۔ دوسری حد ہے اذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ یہی دو حدود ہیں جو اسلامی اجتماعی حکمت عملی کو متعین کرتی ہیں۔

جہاں تک اطاعت اللہ و رسول کا تعلق ہے یہ کسی شرط سے مشروط نہیں۔ اس میں تساہل۔ تجاہل۔ لیت و لعل قطعاً قابل معافی نہیں۔ من یعص اللہ و رسولہ ـــــ الخ "جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اس کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ اطاعت اللہ اور رسول کے بعد تیسرے درجہ پر اطاعتِ امیر آتی ہے۔ امیر کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اس لئے کہ رسول کے بعد وہی ملت کی شیرازہ بندی کر سکتا ہے۔ اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔ لیکن آیۂ اطاعت میں امیر کے باب میں ان تنازعتم نے تنازعہ کا امکان تسلیم کر کے تنازعوں کو اللہ اور رسول کے احکامات کی روشنی میں رفع کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اوپر کی گزارشات سے یہ تو واضح ہو گیا کہ بنیادی اختلاف یہاں بڑی حد تک خارج از بحث۔ Out of question ہے۔ فروعی اختلاف رہ جاتا ہے "ان تنازعتم" میں ایسے ہی اختلافات کے لئے ارشاد ہوا کہ وہ اللہ کے واضح احکامات اور اُسوۂ رسول کی روشنی میں طے کئے جائیں قرآن اور اسوۂ رسول نے ہمیں زندگی کی کسی وادی یا گھاٹی میں سب سے

دلیل و ہدایت نہیں چھوڑا۔ استنجے کے ڈھیلے کے طریقوں سے بے کر سلطنت و حکومت تک کے آئین وضع کر دیئے گئے ہیں ان حالات میں زمان و مکان کے تغیرات کے ماتحت ان اصولوں کی تطبیق Application میں تو اختلاف اور تنازعہ کی صورت ہو سکتی ہے۔ بنیادی اور اصولی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن تفصیلاً لکل شیٔ اور تبیاناً لکل شیٔ ہے۔ یہ تبیین و تفصیل اُن اصول اور کلیات کو ہمارے سامنے صاف صاف پیش کر دیتی ہے جن پر حیات اُمت تعمیر ہونی چاہیئے۔ لیکن جہاں کسی فرع کو اصول سے تطبیق دینے میں اشکال پیدا ہو وہاں قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے کہ اس کو اللہ اور رسول کی طرف اور رسول کے بعد اُمت کے امیر کی طرف لوٹایا جائے یعنی اس کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ تاکہ اختلافات ناگوار حد تک نہ بڑھیں۔ اور اُمت کا شیرازہ درہم برہم نہ ہونے پائے :- واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ط ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم ولو لا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطٰن الا قلیلاً (۴:۸۳)

ترجمہ ان (بدطینت) لوگوں کے پاس جب کوئی امن یا خوف کی خبر پہنچتی ہے تو وہ اس کو لے اڑتے ہیں (حالانکہ) اگر وہ رسول کی طرف رجوع کرتے یا اُن امیروں کی طرف جو حقیقت کا کھوج نکال لیتے ہیں تو وہ اس کو خوب جان لیتے۔ (اے مسلمانو!) اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تم میں سے اکثر

شیطان کے پیرو بن جاتے"

ان لوگوں کو جو ایسے اختلافات میں امیر کی طرف رجوع نہیں کرتے یا اُن لوگوں سے روشنی حاصل نہیں کرتے۔ جن کو اللہ تعالٰی نے بصیرت عطا فرمائی ہے شیطان کے پیرو قرار دیا ہے۔

لیکن رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے بعد جو بھی مسلمانوں کا امیر ہوا ہے یا ہوگا غیر نبی ہوگا۔ لہٰذا معصوم نہیں ہو سکتا۔ اُس سے خطا اور لغزش کا امکان ہے۔ ہر چند ملت کی باگ ڈور ایسے شخص کے سپرد ہو گی جو پاکیزگی نفس اور سیرت و کردار میں سب سے ممتاز ہو مگر قرآن جو پیغام آخری اور فطری ہے انسانی کمزوریوں کو بجا الاؤنس دیتا ہے ان کمزوریوں کے سبب امیر سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو سکتا ہے جس سے اُمت میں اختلاف اور انتشار پیدا ہو۔ ان صورتوں میں اُس کا فرض ہے کہ قرآن و رسول کی طرف رجوع کرے۔ اور شاورھم فی الامر کے ماتحت اکابر اُمت سے مشورت کرے مگر اس میں حکمت یہی ہے کہ یہ مشاورت نفاذِ حکم کے وقت اتمام حجت کا کام دے سکے۔ شاورھم فی الامر اور امرھم شوریٰ بینھم امت کی بہتری کے لئے ہے۔ لیکن جب اور جہاں اس آیت الٰہی کے ساتھ تلعب کر کے ملت کے قائم شدہ نظام کو اپنی ہوا و ہوس اور شر پسندی کا تختۂ مشق بنائے جانے کا احتمال ہو وہاں اِذا عزمت فتوکل علی اللہ کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ مشورت اور مشورت کے بعد عزم کی تاکید اسی لئے ہے کہ لاطائل بحثوں

مجلس آرائیوں اور مناظروں میں اُمت کے قوائے عملیہ شل ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ وہ اپنے امیر کی اطاعت کر کے یکجہتی اور عزم و ثبات کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہو سکے۔ جو خدا۔ رسول اور رسول کی لائی ہوئی کتاب نے اس کے لئے روزِ ازل سے مقدر کر دی ہے۔

۲۹۔ خلاصہ بحث

اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر چونکہ منکم ہے وہ بھی عام مسلمانوں کی طرح اطیعوا اللّٰہ والرسول کا پابند ہے۔ قرآن کے واضح احکام اور اُسوۂ رسول کی تابندہ مثالیں اس کے لئے چراغ ہدایت ہوتی ہیں۔ مسلمانوں پر رسول کے بعد اس کی اطاعت اور اس کی طرف رجوع از روئے قرآن فرض اور تقاضائے ایمان ہے۔ اسلام ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ملت بے نظام اور بے مرکز حیات بسر کرے۔ اس قسم کی زندگی غیر قرآنی اور غیر اسلامی ہے۔ جو اس قسم کی زندگی پر مصر یا مطمئن ہے مومن نہیں ہے۔ مومن وہی ہے جو اللّٰہ کی توحید کو زندگی کے ہر پہلو میں غالب رکھے اور اس کا اولین مظہر قومی یکجہتی اور اجتماعیت ہے۔ لیکن چونکہ قرآن صرف اُصول پیش کرتا ہے اس لئے رسولؐ کے بعد اُن اُصولوں کو حیات کے

سے۔ رفع الالتباس کے لئے بیان یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی زندگی میں اور حضورؐ کے بعد بھی اولی الامر سے مراد مرکزی حکومت کے

عملی مسائل پر منطبق کرنے وقت زمانی اور مکانی تغیرات پیچیدگیاں پیدا
کر سکتے ہیں اور اُن کو رفع کرنے میں امیر سے جو رسول کی طرح ملہم من اللہ
نہیں ہوتا۔ لغزشیں سرزد ہونے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا امیر کے لئے مشورت
کو ضروری قرار دیا گیا۔ تاکہ اس مشورت کے بعد جب ایک متفقہ فیصلہ امیر
کے حکم کی شکل اختیار کرے تو کسی فتنہ پسند یا فساد پرور طبیعت کو اس سے
سرتابی کی مجال نہ رہے۔ یہاں آکر اطاعت ناطق اور غیر مشروط ہو جاتی ہے
ہر کہ و مہ کو بلا حجّت و دلیل یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ ذاتی میلانات کی شہ پاکر
ملت کے نظام میں روڑے اٹکائے۔

پھر اس اُمت کے لئے جس کی قوت تین سو سال سے پارہ پارہ
ہو چکی ہو۔ جس کا کوئی مرکز نہ ہو۔ جس کا کوئی نظام نہ ہو۔ جس کے علماء (الا
ماشاءاللہ) پیٹ کے بندے۔ اور زعماء روحِ اسلام سے بیگانہ ہوں۔ جس کے
نشیمن کا تنکا تنکا ہوا و ہوس کے جھکڑ نے اڑا ڈالا ہو۔ جس کے صحن سے خود غرضی

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۵

عمّال ہیں اور مرکز نہیں۔ اسلامی حکومت میں مرکز اللہ اور رسولؐ کا قائم مقام ہو
جاتا ہے۔ اس لئے مرکز ملت کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے مترادف ہے،
اگر مسلمانوں میں اور حکومت کے ماتحت عمّال میں تنازعہ کی صورت پیدا ہو جائے تو
دونوں کو مرکز کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ خود مرکز سے تنازعہ کی صورت میں مرکز اور
امت دو فریق ہو جائیں گے جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی سمجھ کے مطابق "خدا اور
رسول کے احکام سے استنباط کریگا اور مناظرے اور مجادلے کا میدان گرم ہو
جائے گا۔ (مصنف)

اور نفس پروری کی ہلاکت انگیز آندھیاں اُٹھ رہی ہوں۔ جس کے اُجڑے چمن میں بے راہ روی اور انفرادیت کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔ جہاں اپنوں سے عداوت اور غیروں کی خوشنودی طاعت و عبادت کا درجہ اختیار کر چکی ہو وہاں اصلاح احوال کی کوئی اور شکل بھی ہے ؟ کیا اس قسم کی طوائف الملوکی اور شیطانی ہڑبونگ کا علاج یہی نہیں کہ ایک مرد مومن اُٹھے اور پھران "دیر نشینوں" اور "کلیسا نوازوں" کو ایک ہی شیرازہ میں باندھ کر ایک ہی خدا کے آگے جھکا دے اور ایک ہی خدا کے آگے جھکا کر ثری سے ثریا تک پہنچا دے۔ پھر ایک مرکز۔ ایک جماعت۔ ایک صف۔ ایک آواز ایک کارواں۔ ایک منزل اور ایک ہی بانگ درا کا سماں پیدا کر دے ؟

باب چہارم

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم!!

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ حیات انگیز سماں کیونکر پیدا ہو؟ جب تک یہ اہم سوال حل نہیں ہوتا اطاعت امیر کی صرف لفظی اور فقہی تحقیق و توضیح درد ملت کا چارہ نہیں ہو سکتی۔ اب تک جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اُس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ :-

(۱) اسلام ایک اجتماعی ضابطۂ حیات ہے۔

(۲) اس کی غایت اولیٰ انسانوں کی ایسی ہیئت اجتماعیہ کی تعمیر ہے جو نسل۔ رنگ۔ زبان اور جغرافیائی اختلافات اور امتیازات کے باوجود ایک برادری ہو، اور جو اس مکمل۔ آخری اور الہامی مقصد کے لئے جیئے اور مرے جو محمد مصطفےٰ ؐ کی خاتم النبیینی کے طفیل روز ازل سے اُس کے لئے پسند کیا گیا ہے۔

(۳) قیام جماعت اس عظیم الشان اور آفاق گیر برادری کی تعمیر کی طرف پہلا قدم ہے۔

(۴) قیام جماعت، اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس جماعت

کو وجود میں لانے والے افراد کے اذہان و قلوب کی کایا پلٹ کر ان میں اٹھان (عمت) امید کا جذبہ نہ پیدا کر دیا جائے۔

نوعیتِ مسئلہ

اس جذبہ کی پرورش کے لئے کس قسم کی فضا کا ہونا ضروری ہے؟ اور ایسی فضا کس طرز کے ساز و سامان سے پیدا ہو گی؟ اس کو وجود میں لانے کے لئے ہمارے پاس کیا سرمایہ موجود ہے اور عملی اقدام کس اصول اور کس جہت سے ہو گا؟ یہی چند مسائل ہیں جن پر اب ہمیں غور کرنا ہے۔ ان مسائل میں سے ہر مسئلہ بجائے خود ایک مستقل اور ناپیدا کنار موضوع ہے جس پر گہرا غور و فکر درکار ہے۔ فکر و نظر اور کاوش و سعی کی اس طاقت شکار وادی میں گذشتہ سو سال میں ملت کے مفکرین، مدبرین اور زعمائے کرام نے جو جو جوہر دکھائے ہیں وہ مختلف اداروں، مختلف تحریکوں اور مختلف کارناموں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ ان سب پر تنقیدی نظر ڈال کر ان کے معائب و محاسن کو الگ الگ کر کے دکھانا اور ان کی تنقیص یا تحسین اس مقالہ کی غایت سے نہ صرف دور ہی جا پڑتی ہے بلکہ اس سے کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس طرز کی کوششیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے تعمیر کی بجائے تخریب اور تنویر و بصیرت کی جگہ تاریکی و گمراہی بڑھتی ہے۔ اس ڈھب پر سوچنے اور سمجھنے والا ہر قائد یا مصنف جو بڑی سے بڑی خدمت

انجام دے سکتا ہے وہ مآل کار اس سے زیادہ اور کچھ بھی ثابت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد اپنی ہی طرح مسائل کو الجھانے والا ایک گروہ پیدا کر لیتا ہے اور پھر انجام کار اپنے ساتھ اس گروہ کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ یہ روح فرسا اور قیامت خیز منظر زندگی کے ہر شعبے میں ہمیں درپیش ہے۔ اس دھواں دار اور غبار آلود پریشانیٔ خیال میں آج ملت کا نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر تحریک اور ہر سعی کے شروع کرنے والے قائد یا جماعت کا دعوے یہی رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہمہ گیر انحطاط کا علاج کر کے اس کو قوت و شوکت اور سطوت و عظمت کی بلندی پر پہنچانے کے لئے میدان میں آیا ہے۔ مگر کیا یہ دردناک حقیقت نہیں کہ ہندوستانی مسلمان آج تک اتنی سی بات پر بھی اپنے ذہن میں صاف نہیں کہ اسلام جس کے طفیل وہ مسلمان ہونے کا دعوے کرتا ہے اُس سے کیا چاہتا ہے اور دنیا میں اس کا آخری اور ابدی نصب العین کیا ہے؟ ڈیڑھ سو سال کی محکومی نے مسلمان سے نہ صرف تخت و تاج اور تلوار چھین لی ہے بلکہ اُس سے حسیات و جذبات ایمان و عواطف۔ سیرت و کردار اور رفتار و گفتار کا جمال بھی چھین کر اس کے سینے کو دل اور دل کو نظر تک سے محروم کر ڈالا ہے!! آج ۷۲ فرقوں کا کیا رونا جتنے "مسلمان" اتنے ہی "اسلام" کا توحید سوز اور خدا آزار منظر ہمارے سامنے ہے۔ ایک گروہ اسی دھن میں دین و دل کی بازی لگا چکا ہے کہ اس کی نماز حیات کا رخ "طاقت فرماں روا" کے قبلے کی طرف رہے دوسرا گروہ فرزندانِ توحید کے ہر مرض کا علاج "وطنیت" کی دیوی کی پوجا

میں دیکھ رہا ہے۔ تیسرا گروہ "مذبذب الطرفین" بنے رہنے ہی کو اپنی سیاست اور فراست کا سانواں آسمان سمجھ رہا ہے۔ چوتھا مقدس اور منقطع گروہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشید کے سنہری اصول پر نہ الٰی الذی ہے نہ اُلاالذی ہے۔ اور فقط ساحل ہی سے رزم خیر و شر کا تماشا دیکھ رہا ہے اور کبھی کبھی ادھر یا ادھر کو منہ پھیر کر لاحول ولا قوۃ پڑھ ڈالنے ہی پر اکتفا کر رہا ہے۔ پانچواں گروہ "خلافت الٰہیہ" کا لاہوتی نعرہ لگا کر ہی سمجھ رہا ہے کہ بس خلافت الٰہیہ قائم ہو گئی حالانکہ اُس غریب کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ خلافت الٰہیہ کسے کہتے ہیں اور اس کے۔ لئے کیا ساز و سامان درکار ہے اور کم از کم اسے زیب نہیں دیتا کہ اس مقدس نام کو اپنی زبان پر لا کر میلا کرے۔ چھٹا گروہ اسلام کے واضح اور بیّن تقاضوں سے منہ موڑ کر ہر رطب و یابس کو اپنے اندر جذب کرتا۔ برساتی نالے کی طرح شور مچاتا، اور کھوکھلے مگر فلک شگاف نعرے لگاتا ہوا بڑھا چلا جا رہا ہے کس منزل کی طرف؟ ابھی ٹھیک ٹھیک متعین نہیں!! اس منزل کا نام کیا ہے؟ ابھی معلوم نہیں۔ وہ منزل کعبے کے آس پاس ہے یا ترکستان میں؟ جاننے کی ضرورت نہیں!!! الغرض ؎

ہند میں منزل مقصود مسلماں کی ہے کیا؟
آج تک طے یہی پیران حرم کر نہ سکے!! (مصنّف)

فکر و نظر کے یہ دھوکے سعی و عمل کی یہ گمراہیاں اور سیرت و کردار کی یہ جانکاہیاں کبھی پیش نہ آتیں اگر مسلمان اور مسلمان کی تقدیر کی باگ ڈور

سنبھلنے والوں کے سامنے قرآن حکیم۔ اسوۂ نبی کریمؐ اور اسلاف عظیمؒ کی سیرت کی روشن قندیلیں موجود ہو تیں۔ ان "بے پرواہیوں" اور ان بے پناہیوں کی بے پناہیوں پر رونے اور جبینِ ملّت کے سیہ دھبّوں کو آنسوؤں سے دھونے سے یہ بہتر ہے کہ اصلاح احوال کی خلوص دل سے سعی کی جائے اور روٹھے ہوئے مگر رحیم و کریم خدا کو **قلب منیب اور عملی فرمانبرداری** سے خوش کرنے کی طرف قدم اُٹھایا جائے اور ہر اٹھے ہوئے قدم سے منزل مقصود کو قریب تر لایا جائے۔

۴۱۔ قوموں کی عظمت کی بنیاد افراد کی بلند سیرتی پر ہے

قوموں کی عظمت اور علوِ مرتبت کی بنیاد افراد کی بلند اور پاکیزہ سیرت پر ہے۔ کوئی قوم جو دنیا میں عزت و آبرو سے جینے کی آرزومند ہو اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک ہر فرد انہیں مقاصد، انہیں آرزوؤں انہیں جستجوؤں۔ انہیں امنگوں اور احساس و فکر کی انہیں پاکیزگیوں کا حامل نہ ہو جو اس قوم کے طے شدہ نصب العین کے نسبت سے اسکے حصول کے لئے قوم میں لازمی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے لیکر آج تک احیائے ملّت کی عظیم الشان تحریکوں کے بری طرح ناکام رہنے یا اپنی

مقررہ راہ سے بھٹک جانے کی تاریخی وجوہات میں سے سب سے بڑی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ افراد کی سیرت کی طرف سے یکسر آنکھیں بند کر لی گئیں اور چونکہ ان تحریکوں کے بانیوں نے باوجود صاحب نظر ہونے کے فرداً فرداً دلوں پہ اپنے نور کی شعاعیں نہیں ڈالیں۔ دل بے نور رہے اور ان کی تحریکوں کی روح اور اس روح کا خطاب افراد کے دلوں میں گھر نہ کر سکا ہر تدبیر خیالات کی سطح پہ تیرتی رہی اور ہر آواز صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔ اب جبکہ ملت کے مایہ ناز مفکرین۔ مدبرین۔ سیاسیئین۔ زعما۔ علما اور شعرا نے ملی زندگی کے ہر گوشے، ہر وادی اور ہر گھاٹی کو اپنے فکر و نظر اور تدبر کے نور سے روشن کر ڈالا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ وقت ضائع کئے بغیر منزل المقصد تک پہنچنے کا جو سیدھا اور صاف راستہ ہے اختیار کر لیا جائے۔ یعنی افراد کی سیرت کو ہمہ گیر طور پر تربیت دینا شروع کر دیا جائے۔

۳۲۔ خاص افراد اور عام افراد

جس طرح اجتماعی تحریکوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ افراد کی صلاحیتوں یا کمزوریوں سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں اسی طرح انفرادی تحریکوں کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ خاص افراد Intelligensia اور عام افراد Masses کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بر اسی

بلے ڈھب عمل کی کرامت ہے کہ جہاں ایک طرف مغربی علوم و فنون سے
سیر کام نوجوانوں میں نہ صرف مذہب و ملت سے کامل بے اعتنائی Indifference
...... بلکہ شعائر دین اور عام ملی تقاضوں سے نفرت، استہزا اور تمسخر
کا رویہ پیدا ہو چلا ہے وہاں دوسری طرف عوام احساس و شعور کی بیداری کے
لحاظ سے آج بھی عملاً اسی جگہ ہیں جہاں وہ آج سے نصف صدی قبل تھے۔
اور اگر انفرادی اصلاح سے چشم پوشی اور صحیح تربیت سے غفلت کا یہی عالم
رہا تو نہ صرف جدید طرز کے نوجوان بلکہ عوام بھی حرم سے بغاوت کر دینگے
اور یہ بغاوت اتنی ہمہ گیر اور تند و تیز ہوگی کہ اس کو قیادت و سیادت کی
کوئی تدبیر نہ روک سکے گی۔ موجودہ جنگ میں ہر زندہ قوم نے اپنی ملی ہستی
کے بقا اور اپنے حقوق کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔ اور ہر قوم
"ہر کجا راہ دہد اسپ بر آں تاز" کے اصول پر مشرق و مغرب کی پہنائیوں
پر چھا جانے کے تہیہ سے اپنا اور اپنے حریفوں کا خون بے دریغ بہا رہی ہے
اس بات پر شوق سے الحمد للہ پڑھئے کہ عالم اسلامی اس ہولناک اور
قیامت خیز ہنگامہ کشت و پیکار اور تباہی و بربادی سے کسی نہ کسی طرح
محفوظ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عالم اسلامی نے چاروں طرف جنگ کے خونین
شعلوں میں محفوظ رہ کر بڑھنے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لئے کیا کیا۔ ایک
عالمگیر جمود و سکون اور تجرد و دہشت کی موت ہے جو اس پر طاری ہے۔
ہندی مسلمانوں کی حالت بھی تقریباً یہی ہے۔ جنگ قریب الختم ہے اس سے
پیدا ہونے والے حالات کی ہر کروٹ نگہداران ملت کو پکار پکار کر کہہ رہی

ہے کہ آنے والے انقلاب کی نظر اور رخ پہچان کر اپنے آپ کو درست کر لیں۔

۳۳۔ افراد کی اصلاح اور تعلیمی ادارے

مسئلے کا یہ پہلو ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کرتا ہے، جہاں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے کہ افراد کی سیرت کو اسلام کے بے مثل اور اٹل سانچے میں ڈھلنے کے لئے تعلیمی اداروں کی خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی۔ قدیم ہوں یا جدید۔ فوری اصلاح اور مکمل انقلاب Overhauling کی ضرورت ہے، ورنہ کوئی بیل منڈھے نہ چڑھ سکے گی اور غلامی کی موجودہ اور گذشتہ چار نسلوں پر گہری نظر ڈال کر اسباب نہ لت تلاش کیجئے تو ان میں سب سے بڑا سبب تعلیم کا ناقص نصاب۔ فرسودہ نظام بوسیدہ طریق اور اکثر جہات سے بیہودہ تربیت نظر آئے گی۔ عربی و فارسی مدارس اور انگریزی سکولوں و کالجوں نے جس جس طرز کے "فارغ التحصیل" پیدا کئے ہیں وہ گرتی ہوئی قوم کو سہارا دینے کے لئے اپنے حاصل کردہ علم و فن کی مدد سے کچھ بھی نہیں کر سکتے اس میں شبہ نہیں کہ مکتبے قُل اعوذ یوں اور کالج کے مسٹروں میں سے کچھ مایہ ناز فرزند ایسے بھی نکلے ہیں جن کے کارہائے نمایاں پر اللہ کا جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ مگر اس قسم کی مثالیں شاذ ہیں اور تعلیمی اداروں کے ناقابل اطمینان

ہونے کا جو کلیہ قائم ہو چکا ہے اُسے بہ چند مستثنیات اور بھی زیادہ صحیح ثابت کر رہی ہیں۔ یہ چند مثالیں مکتب کی کرامت نہیں بلکہ گھر کی تربیت اور خاندانی ماحول کا صدقہ ہیں۔ ہماری درسگاہوں کی غالب اکثریت علمی و فنی کامیابی کی جو "سندیں" لے کر نکل رہی ہیں وہ دراصل ملّت کی ذلّت۔ قومی کیریکٹر کی تباہی۔ عملی صلاحیتوں کی کامل ویرانی اور سیرت و اخلاق کی ہمہ گیر ناہمواری کی شرمناک دستاویزیں ہیں جن پر "درست" ہونے کی سرکاری مہر نمایاں طور پر ثبت ہے۔ مکاتب میں جہاں فلسفہ و منطق۔ صرف و نحو اور فقہی روایت و درایت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہاں عصرِ رواں کی سائنٹیفک ترقیات۔ صنعتی اور دیگر مادّی نظریاتِ زندگی سے پیدا ہونے والے طوفانی مسائل سے کامل بے اعتنائی برتی جا رہی ہے اور اگر اس طرف کچھ التفات ہے بھی تو قدیم اور جدید علوم کا تقابل و تجزیہ طالب علم کے سامنے اس طور پر پیش نہیں کیا جاتا کہ اس میں بصیرت اور تحقیقی نظر پیدا ہو کہ اس کی تخلیقی قوتیں بیدار رہیں۔ بعینہٖ اسی طرح کالج اور یونیورسٹی کے نصاب اور طرزِ تعلیم سے سامراجی نظام کی ہیبت ناک مشین چلانے والے چھوٹے بڑے کل پرزے تو بکمال حسن و خوبی تیار ہو رہے ہیں مگر وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے جن کی آج ملّت کو ضرورت ہے۔ اس کا شکوہ قومِ غالب سے فضول ہے اس لئے کہ غالب کے غلبے اور مغلوب کی مغلوبیت کا راز یہی ہے کہ مغلوب پر کسی جہت سے بھی رازِ حیات فاش نہ ہو سکے۔

اک لرڈ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر!
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم
بَرّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر!
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر!
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر! (اقبالؒ)

۴۳۔ خداوندانِ مکتب کی توجہ کے قابل

جو بات نئی اور پرانی طرز کی درسگاہوں اور ان کے ارباب اہتمام کی مشترکہ سوچ بچار کی محتاج ہے، یہ ہے کہ اسلام کو مسلمان اور خصوصاً نئی نسل کے قلب و ضمیر پر پھر نازل کر کے اس کے تقاضوں کو اس کی فطرت میں راسخ کرنے کے سامان کئے جائیں۔ یعنی تعلیمی نصاب اس اصول پر ترتیب دیئے جائیں کہ اسلام کو بحیثیت ایک نظریہ حیات، ایک جمیل ترین اور مکمل ترین ضابطۂ زندگی کے نوجوان کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ جدید

تعلیمیافتہ نوجوانوں کی سیرت پر اس حقیقت کو مرتسم کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام ایک بے پناہ قوّتِ حیات ہے جس سے انسانوں کا اپنا گھڑا ہُوا جو ضابطہ اور نظریہ بھی ٹکرائے گا پاش پاش ہو کر رہ جائیگا۔ کسی قوم پر جسمانی غلامی اس وقت تک نازل نہیں ہو سکتی جب تک اسکی سیرت۔ ذہنیّت اور نفسیات پر محکومانہ تخیل اپنا تسلّط قائم نہیں کر چکتا۔ آزادی و حرّیت کے فلک شگاف نعرے اس وقت تک مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جب تک کہ پہلے ذہنی و خیالاتی غلامی کا دارو نہ سوچ لیا جائے۔ آج ملت کا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی علوم و فنون۔ مغربی رسم و رواج۔ مغربی تہذیب و تمدن اور سب سے بڑھکر مغربی نظریات حیات مثلاً جمہوریّت۔ اشتراکیت۔ نازیّت۔ فاشیّت وغیرہ سے نہ صرف ذہنی طور پر مرعوب ہے بلکہ عملی طور پر ان کا فرزانہ سانچوں میں اپنا چلن ڈھال چکا ہے۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ ان کے مقابلے میں اسلامی علوم و فنون۔ اسلامی رسم و رواج۔ اسلامی تہذیب و تمدن اور آئین و شعار پرانی داستانیں ہیں جن کا تذکرہ بھی فکر و نظر کی "بیرواز" کی توہین ہے۔

۳۵۔ ملّت کی تشکیل آغوشِ مادر میں ہوتی ہے

ملّت کی تشکیل آغوشِ مادر میں ہوتی ہے۔ یہی راز ہے جس سے کالجوں اور مکتبوں میں تعلیم پانے والی نئی پود کی مائیں اور باپ ناواقف ہیں۔ عام

طور پر، اعلیٰ تعلیم دلوانے کی سکت امیر گھرانوں یا فدرے مرفع الحال متوسط طبقے میں ہوتی ہے اور ٹھیک یہی دو طبقے ہیں جن کے بچوں کی تربیت آغوش مادری سے لے کر ثانوی تعلیم کے زمانہ تک سخت ناسازگار فضا اور غیر منضبط ماحول میں ہوتی ہے۔ اِلاّ ماشاء اللہ —— جب بچے اور نوجوان مدرسوں اور کالجوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے اذہان و قلوب پر اسلام کی عظمت۔ اس کے بنیادی اصولوں کی برتری اور اس کے بتلائے ہوئے نصب العین کے جمال جہاں تاب کا کوئی نقش نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مغربی طریقۂ تعلیم اور مغربی مقصدِ تعلیم ان کی سیرت کی سادہ لوح پر جو نقش ابھارنا چاہتا ہے عمدگی سے اُبھر آتے ہیں۔ طالب علم کا مطالعہ اور شعور جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے ان نقوش کی پرورش بھی ساتھ ساتھ ہوتی چلی جاتی ہے۔ فی ہزار شاید ہی دس طالب علم ایسے ہوتے ہوں جو اپنے صاحب نظر والدین کی تربیت کی برکت سے تعلیم سے پیدا ہونے والی جہالت اور ظلمت کا پردہ چاک کر کے اپنے فطری اور ملّی جمال کو دیکھ لیتے ہوں، ورنہ انگریزی نصابوں سے پیدا ہونے والی تاریکی اور گمراہی نوجوانوں کی فکر و نظر اور سیرت کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ ان "فارغ التحصیلوں" کو اگر علم و عمل کے چلتے پھرتے جنازوں سے تشبیہ دی جائے تو شاید درست ہوگا۔ یہ تعلیم نوجوانوں کو صحیح باطن قسم کے ہمہ دان Jack of all & master of none تو ضرور بنا دیتی ہے مگر کسی ایک علم یا کسی ایک فن میں کمال اور اس سے عملی استفادے سے کوسوں دور رکھتی ہے۔ ان میں

جسمانی و روحانی صحت۔ سیرت و اخلاق کی بلندی۔ ارادوں کی پائیداری اور قوت فیصلہ کی مضبوطی کا پیدا ہونا ناممکن بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس کالجوں اور سکولوں کے بورڈنگ ہوسوں اور ہوسٹلوں کی زندگی۔ ان پر نگرانی کا فقدان۔ یا خود نگرانوں میں اسلامی سیرت کا نہ ہونا۔ کالج یونینز کے زیر اہتمام لایعنی و سفلہ طرحی اور غیر طرحی مشاعرے۔ ہزلوں اور غزلوں کی بھرمار۔ ہزل نگاروں اور غزل خوانوں کو ہر طرف سے واہ وا اور شاباش، یہ اور اسی طرز کی بیسیوں خرافات مردہ دل۔ کور ذوق۔ دوں ہمت کم سواد اور "شاعر" و "عاشق" قسم کے نحیف و ناتواں فرد تو پیدا کر سکتے ہیں مگر بلند حوصلہ۔ بلند نظر اور تنومند نوجوان جو انفرادی و اجتماعی نصب العین کے لئے مر مٹنے کی لذت سے آشنا ہوں نہیں پیدا کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ہماری درسگاہوں کی موجودہ پیداوار کے لئے انفرادی اور اجتماعی کشمکش حیات میں کچلے جانے اور پامال ہو جانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

۳۶۔ معلّمین کا اثر متعلّمین پر

مگر ان تلخ حقائق کی ذمہ داری صرف غیر تسلی بخش اور نامناسب نصاب اور طریقہ تعلیم پر ہی نہیں ڈالی جا سکتی۔ بلکہ اس کی بیشتر وجہ خود معلّمین و اساتذہ کی کم نظری و کم سوادی ہے۔ معلّمین کی اپنی سیرت و تعلیم

رفتار و گفتار کا فراز اور غلامانہ ملمع سازیوں کا شاہکار ہوتی ہے۔ اِن استادانِ ملّت میں اگر کچھ واجب احترام مستثنیات ہیں بھی تو ان میں وہ ذاتی جذب Personal Magnatism اور اثر اندازی کا جادو نہیں کہ وہ اپنے متعلّمین پر فرداً فرداً نگاہ رکھ کر ان کی روحوں اور سیرتوں کی کایا پلٹ سکیں۔

۷۳۔ مختلف عارضوں کیلئے مختلف دواؤں کی ضرورت

خاص افراد اور عام افراد کے عنوان کے ماتحت عرض کیا جا چکا ہے کہ تعمیر ملّت کے لئے کوئی اجتماعی قدم اُٹھاتے وقت دونوں قسم کے افراد میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی بیماریاں الگ الگ ہیں اور دونوں کی بیماریوں کے اسباب مختلف ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے علاج کی نوعیت جداگانہ ہوگی۔ پھر اس خاص گروہ میں بھی جو مکتبوں اور کالجوں میں زیر تربیت ہے عربی اور دینی قسم کے طلبا کے عارضوں کی کیفیت اُس سے مختلف ہے جن کا شکار انگریزی طرز کے کالجوں اور سکولوں کے طالب علم ہیں۔ یہ باریکیاں اس مقالے کی غایت سے دور جا پڑتی ہیں لہٰذا اشارات و کنایات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی فقہ، فلسفہ، اصول تفسیر، تاریخ اور علم کلام وغیرہ پر اجتہادی نظر ڈال کر طالب علمی کے ہر دور اور تلقین و تربیت کی ہر طرز کے نصاب از سر نو ترتیب دیئے جائیں۔ یہ کام ملّت کے ان مفکّرین

اور ماہرین تعلیم کے کہنے کا ہے جن کی نگاہِ بصیرت پر یہ مسائل بے حجاب ہیں۔ اور جو اسلام کے تقاضوں سے باخبر اور اس کی آخری منزل سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سینوں میں درد مند دل بھی رکھتے ہیں۔

ملت کی باگ ڈور ہمیشہ پڑھے لکھّے طبقے کے ہاتھ میں رہی ہے اور رہے گی۔ جونہی اس کی اصلاح ہو گئی عوام کی درستی کی راہیں خود بخود پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ قوم کا دل اور دماغ بیماریوں سے نجات پا گیا تو باقی اعضاو جوارح کا عمل خود بخود درست ہو جائے گا۔

۴۸۔ ہماری انجمنیں اور یتیم خانے

تعلیمی اداروں کے بعد انفرادی اصلاح کے سلسلے میں انجمنیں اور یتیم خانے بیحد اہم ہیں۔ قوم کی زبوں حالی۔ تفرق و انتشار۔ مردنی اور گراوٹ کی دردناک تصویر دیکھنا ہو تو انجمنوں اور یتیم خانوں کی فراوانی پر بھی ایک نظر کیجیئے۔ اسلام کے نام پر پچاسوں انجمنیں اور یتیموں کے طفیل بیسیوں یتیم خانے کھلے ہوئے ہیں۔ "انجمن معین الاسلام"۔ "انجمن رفیق الاسلام"۔ "انجمن تائید الاسلام"۔ "انجمن تعلیم الاسلام"۔ "انجمن انصار الاسلام" وغیرہ اسلام کی اِس "اعانت"۔ "رفاقت"۔ "تائید"۔ "تعلیم" اور "نصرت" وغیرہ کے نتائج سے آگاہ ہونا ہو تو ان انجمنوں کے اہتمام میں چلنے والے اور خود رو یتیم خانوں کو دیکھئے جن میں ملّت کے سایۂ پدری اور شفقتِ مادری سے

محروم بچوں کو اجتماعی اور انفرادی گداگری کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس تعلیم کی کامیابی و ناکامی کا مقیاس یہ ہے کہ ایک یتیم بچہ یا چند یتیم بچوں کا ایک گروہ انجمن کی سرپرستیوں پر پلنے اور جائیدادیں بنانے والے منو لیوں اور ان متولیوں کے نگے بندھے مہتمموں معلّموں اور دوسرے "افسروں" کے لئے شام کو کتنی بھیک مانگ کر لاتا ہے۔ گلی کوچوں میں۔ ریلوے مسافر خانوں میں۔ چلتی ٹرینوں میں میلوں ٹھیلوں میں، مذہبی اور قومی اجتماعوں میں میلے کچیلے۔ برہنہ پا، برہنہ سر، غمزدہ اور آفت رسیدہ بچوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں بھیک مانگ مانگ کر قومی بے مرکزی اور بے جمیتی۔ سفلہ پن اور اجتماعی موت کا رونا روتی پھرتی ہیں۔ ست

" پریشاں بیانی ہے سن لیجئے! یہ غم کی کہانی ہے سن لیجئے!!

" سن لیجئے!! اور دو چار پیسے، رسید لیکر یا زیادہ دریا دلی ہے تو بغیر رسید لئے ان کو دے دیجئے!!! اگر انجمنیں اور یتیم خانے اپنے فرض کو پہچان کر کوئی اقدام کریں تو یتیم بچوں کو در در مارا مارا پھرنے اور گلی گلی "غم کی کہانی" سنانے کی ضرورت پیش نہیں آ سکتی۔ ان شاء اللہ ان معروضات سے معدودے قابل قدر انجمنوں اور چند ایک اچھے یتیم خانوں کی نیک مساعی اور عمدہ کارناموں کا استخفاف مقصود نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ان کو قوم کے لئے صحیح معنوں میں اور زیادہ سے زیادہ مفید اور باعث خیر و برکت و رحمت بنایا جائے۔

۳۹۔ عام افراد

خاص افراد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ عام افراد کی جن میں سے خواص پیدا
ہوتے ہیں کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔ کوئی انقلاب۔ کوئی تحریک اور کوئی
تبلیغ اس وقت تک اپنے مقصد اور منزل کو نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ عام
آبادی کو جو ملک کا ۹۰ فیصد حصہ ہے متاثر اور منقلب نہ کرے۔ یہ کیونکر منقلب
ہونگے؟ یہی سوال ہے جو ایک گری ہوئی قوم کو دوبارہ ابھارنے کیلئے سب سے
زیادہ اہم ہے۔ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل ہے اور لطف کی بات یہ ہے
کہ جس قدر مشکل نظر آتا ہے اتنا ہی آسان بھی ہے۔ آسانی یہ ہے کہ جہاں شہری
اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے کے ضمیر دسیسہ پرست نئی تحریکوں۔ آنی جانی
انقلابوں۔ سیاسی۔ اقتصادی اور تہذیبی نظریوں کی اندھا دھندی نے طرح
طرح کے رنگ چڑھا رکھے ہیں وہاں دیہاتی طبقہ جو غالباً ۸۰ فیصدی سے متجاوز
ہے ابھی پاک نہاد۔ صاف ضمیر۔ پرجوش۔ آمادہ عمل اور پرخلوص ہے۔ اگر اسکی
قوت عمل اور انقلاب آفریں صلاحیتوں کے مالک ہونے کا اندازہ نہیں ہوا
تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے بہت دیر میں جاکر اس بات کا اندازہ
فرمایا ہے کہ دیہات کی آبادی ناقابل فراموش قوت کی مالک ہے حقیقت
یہ ہے کہ اگر دیہاتی آبادی کی روحانی۔ ذہنی اور سیاسی تربیت کسی منصوبہ [illegible]
پر ہوتی تو ہمیں اپنی منزل زیادہ قریب اور زیادہ روشن نظر آتی۔ بعض شہری
دانشمند افراد دماغ زہریلے نظام سے متعلق جو ایک نہایت ہی ذلیل کن خیال

جان گزیں ہے ، یہ ہے کہ اُن میں کسی اچھی تحریک یا اعلیٰ سوال کو سمجھنے اور کام کرنے کی صلاحیت نہیں اور صرف شہری اور تعلیم یافتہ طبقے کی عالی دماغی ہے جو ہر تحریک کو سمجھنے اور کامیابی سے چلانے کی اہل ہے ۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک جتنی اور جس جس پیمانے کی تحریکیں شروع ہوئیں وہ دیہات کو اس طور پر نظر انداز نہ کرتیں ان تحریکوں اور تحریکوں کے قائد ۔ ان کا سارا زور شور شہر تک ہی محدود ہو کر نہ رہ جاتا ۔ یہ حقیقت نہایت ہی خوش آئیند اور نیک فال کی حیثیت رکھتی ہے کہ یہ غلط فہمی اور کوتاہ بینی اب بتدریج ہمارے ذہنوں سے دور ہو رہی ہے ۔

۴۰ ۔ موازنۂ شہر و دیہات

اس حقیقت کو منوانے کے لئے زیادہ زور قلم صرف کرنے کی ضرورت نہیں کہ شہری طبقے کی اکثریت محض تماشبین ہوتی ہے ۔ اس کے نزدیک جلسے ۔ جلوسوں ۔ پنڈالوں اور پنڈالوں کے اندر گونجنے والی تقریروں اور فلک شگاف تکبیروں کا منظر مداری کے تماشے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا بڑی سے بڑی تحریک ۔ عمدہ سے عمدہ تجویز ۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تدبیر وقتی اور ہنگامی جوش کی رو میں بہہ کر ابدی ناکامی اور نامرادی کے ظلمات میں جاکر غرق ہو جاتی ہے ۔ اگر جیلوں کو بھرتے ہیں تو عوام ۔ گھر بار لٹاتے ہیں تو عوام سر کٹاتے ہیں تو عوام اور کون عوام ؟ جنہیں ہمارے روشن خیال عوام محض "کالانعام" سمجھتے ہیں !! حقیقت یہ ہے کہ یہی طبقہ ہے جس سے آخری اُمید

اگائی جا سکتی ہے۔ یہی طبقہ ہے جس کو ملی نصب العین کے حصول کے لئے منظم طریق پر بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ ملت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے جو انقلاب بھی کیا جائے اس کی بنیاد دیہات ہی سے اٹھنی چاہیئے۔ یہی بنیاد ہے جو اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ کا منظر پیش کر سکتی ہے۔

۱۴۔ مساجد اور تنظیم عوام

اس باب کے آغاز میں پچھلے ابواب کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے نمبر ۲ پر عرض کیا گیا ہے کہ اسلام جس جماعت کو قائم کرنے کے درپے ہے اس کا قیام افراد میں اطاعت امیر کا جذبہ پیدا کئے بغیر ناممکن ہے۔ یہی جذبہ ہے جو افراد کی سیرت اور ان کے مظاہر حیات میں جاری و ساری ہو کر ان کو ایک مرکز کی طرف مائل کرتا ہے اور مآل کار ملت کی یکجہتی اور یک نگہی پر منتہی ہوتا ہے مسلمان کی زندگی کا محور مذہب ہے۔ نہیں، بلکہ اسکی تمام زندگی مذہب ہے اور اس کا مذہب شروع سے اخیر تک زندگی۔ دیگر مذاہب کی طرح مسلمان کا مذہب اسکی زندگی کا دُم چھلا نہیں بلکہ اس کا ضابطہ حیات ہے جو زندگی کی پہلی سانس سے لے کر آخری سانس تک اور اسکے بعد اسکی حیات بعد الممات پر بھی حاوی ہے۔ اس میں دوبارہ زندگی کے آثار پیدا ہونگے تو مذہب سے پیچھا چھڑا کر نہیں بلکہ اسکو سینے سے لگا کر۔ باب اوّل کے افتتاحی اشارات ذہن میں ہوں تو یہ حقیقت نمٹر کر سامنے آجائیگی کہ اسلامی ارکان کی ہر شق

زندگی میں بکھیتی۔ اثبات۔ جان۔ روشنی اور حرارت پیدا کرنے کے اسلوب ایک شیرازے میں باندھنے والی ہے۔ اسلامی ارکان، کلمہ طیبہ۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ میں سے کلمہ کی اہمیت اور اس کے مضمرات Implications مسلمان کے ذہن اور قلب سے محو ہو چکے ہیں۔ کلمے کی حیثیت آج ایک زبانی لوٹنے سے زیادہ نہیں رہی۔ اس اقرار کے باوجود کہ اللہ کے علاوہ قطعاً اور کوئی قوت نہیں جسکے آگے انسان بحیثیت اپنے مرتبہ و عظمت کے جھک سکتا ہے آج مسلمان کی جبین انفس و آفاق کی ہزاروں دہلیزوں پر بکمال عجز و انکسار جھکی ہوتی ہے۔ اور اس تصدیق (زبانی) کے باوجود کہ صرف محمد رسول اللہ کی ذات گرامی ہے جس کے طفیل اللہ کی الوہیت کا جاں بخش اور عزت افزا پیغام نصیب ہوا اور اسی گرامی مرتبت شخصیت کا لایا ہوا پیغام ہے جس کو بجان و دل قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہو کر دارین کی سعادت اور کامیابی نصیب ہو سکتی ہے آج مسلمان کی نگاہ عقیدت و عبودیت نئے نئے رہبروں اور نئے نئے پیغمبروں کی طرف اٹھ رہی ہے۔ حج کے ساتھ خود مسلمان کی اپنی درماندگی اور بے چارگی نے جو سلوک کیا اسکے متعلق بھی اشارات میں مختصراً عرض کیا جا چکا ہے اور مرکزی نظام اور بیت المال نہ ہونے کے طفیل فراہمی زکوٰۃ کا تو سوال ہی بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

۴۲۔ نماز کی لم

سو دیکھئے کہ نماز ہی ایک ایسا رکن ہے جو اگرچہ بے روح ہو کر رہ گیا

سے ہے اس کا ڈھانچہ ابھی سلامت ہے اور اس میں تھوڑی سی توجہ۔ تھوڑی سی کاوش۔ تھوڑے سے خلوص اور تھوڑی سی قربانی سے پرانی روح پھونکی جا سکتی ہے۔ گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال میں اسلام اور ملت اسلامیہ پر جو دہر آشوب اور قیامت خیز انقلابات آئے انہوں نے اسلام کی اجتماعیت سیاسی قوت و شوکت۔ علمی تمدنی سرمایہ۔ اور دیگر عظیم الشان روایات کو پارہ پارہ کیا مگر مسجدوں کی پنجگانہ صلوٰۃ و اذان وہ دولت گراں مایہ ہے جو کسی نہ کسی طور ابھی تک "اپنوں" اور پرایوں کی دستبرد سے محفوظ ہے اور یہی وہ عظیم الشان سرمایہ ہے جس کو ملت کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے والے سارے عوامل ایک ایک کر کے شل۔ بے جان اور بے عمل ہو کر رہ گئے ہیں مگر اس گئی گذری حالت میں بھی ان کی سطوت و عظمت کے آخری نشان مسجدیں باقی ہیں۔ اسلامی آبادی کا شاید ہی کوئی موضع۔ قصبہ۔ شہر یا شہر کا کوئی محلہ ایسا ہو جہاں متعدد و یا کم از کم ایک مسجد ضرور نہ ہو۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ۶ لاکھ مسجدیں ہیں جن میں روزانہ پانچ وقت کم از کم پینتیس لاکھ مسلمان با ہتمام اذان و جماعت نماز ادا کرتے ہیں۔

غور کیجئے تو اس حقیقت میں محکوم و مجبور اور نتیر بتر مسلمان کے لئے عبرت و موعظت اور زندگی کے ہزاروں سامان پوشیدہ ہیں۔ اگر مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور قوم اسکی طرح خراب خستہ حال اور منتشر ہوتی جسمیں ایک کلمہ۔ ایک قبلہ۔ ایک مقام حج۔ ایک اُم الکتاب جیسا توحید انگیز اور تسخیر خیز ساز و سامان

نہ ہوتا تو شاید اس کو "تحفہ" یا معجزے سے کم نہ ہوتا مگر افسوس ہے تو یہ کہ جس ملّت کی بنیاد ہی توحید اور توحیدی عوامل پہ ہے آج سب سے زیادہ تفریق و تشتّت کا شکار ہے اور اس کے مقابلے میں تین سے لیکر تین سو پینسٹھ خداؤں اور پروردگاروں تک کو ماننے والی قومیں بھی ذلیل سے ذلیل مقصدِ حیات اور گھٹیا سے گھٹیا ضرورتوں کے لئے فردِ واحد کی طرح، نہ صرف کام کرنے کی اہلیت پیدا کر چکی ہیں بلکہ کائنات کو درہم برہم کر رہی ہیں۔ ع

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک!
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک؟

بات ہے تو صرف اتنی کہ اسلام اور اسلامیت کا ڈھانچہ باقی ہے مگر اس میں روح باقی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس روح کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ تیرہ بختی اور تفریق کے خلاف اس جنگ میں ایسا مورچہ اور ایسا نکتہ تلاش کرنا پڑیگا جہاں سے حملہ کر کے زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد کامیابی کا یقین ہو۔ ہر جہت اور ہر نقطۂ نظر سے غور کے بعد ایسا مقام اور نقطۂ آغاز کار نماز اور مسجدوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ نماز کے لئے اذان۔ اذان کے بعد اقامت۔ اقامت کے بعد صف بندی۔ صف بندی میں بلند و پست۔ خواجہ و بندہ۔ عالم و جاہل اور اسود و احمر کے امتیاز کا نہ ہونا۔ ایک ہی امام۔ ایک ہی رخ قبلہ۔ ایک ہی امام کی آواز پر سب کا اکٹھا رکوع۔ اکٹھا سجود۔ اکٹھا قعود۔ اکٹھا قیام اور پھر آٹھ پہر میں پانچ بار اس منضبط عمل کا فرض ہونا۔ پھر اس فرض کی ادائیگی کو اجتماعی صورت دینے تا کید۔

(وارکعوا مع الرّاکعین ـــــ قرآن حکیم) پھر اس کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنے کا حکم (اقیموا الصّلوٰۃ ـــــ قرآن حکیم) پھر اس کی حفاظت پر زور (حافظوا علی الصّلوٰۃ ـــــ قرآن حکیم) ـــــ یہ سب حقیقتیں اس بات کو واضح کر رہی ہیں کہ اسلام کا مقصد ایک جماعت پیدا کرنا ہے اور جماعت بھی وہ جماعت جو دنیا میں اللہ کے دین کو تمام دینوں پر غالب کرے (لیظہرہٗ علی الدّین کلّہٖ ـــــ قرآن حکیم) اور اس مقصد کے لئے ایک عالمگیر سلطنت پیدا کرے (وعد اللہ الّذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم الخ) اور ایسی سلطنت جو ناقابلِ شکست و ریخت ہو (عُروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا ـــــ قرآن حکیم)

اگر ہر مسلمان نماز کی اس انقلاب آرا اور حیات انگیز روح کو سمجھ کر نماز اور نماز با جماعت کی طرف متوجہ ہو تو اگر اس گئی گزری حالت میں وہ پرانی سطوت و شوکت اور جہانگیر خلافت قائم نہیں کر سکتا تو کم از کم ملّت میں وہ سودا اور جنون ضرور پیدا کر سکتا ہے جو اُمّت کے بٹے ہوئے گروہوں بچھڑے ہوئے طائفوں اور کٹے ہوئے فرقوں کو رفتہ رفتہ چھوٹے چھوٹے مرکزوں سے باندھ کر ایک بڑے مرکز کے تابع جینے کے لئے بیتاب کر دے۔

۴۳۔ آئمہ مساجد

لیکن نمازوں میں یہ روح اس وقت تک پیدا ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی جب تک نماز پڑھانے والے اماموں کو اُن کا کھویا ہوا مقام واپس نہ

دلادیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر محلّہ کے لئے اس محلّہ کی مسجد مرکز ہے اور اس
مسجد کا امام اس محلے کے مسلمانوں کا سردار ہے، نہ صرف دینی سردار بلکہ زندگی
کی ہر دوڑ کا پیشوا! امام کے مقام اور مرتبے کا اندازہ اس سے کیجئے کہ رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ امام وہ ہونا چاہئے جو علم، عمل
عزّت، وجاہت، حسن سیرت اور حسن صورت میں سب سے بڑھکر ہو۔ یا جس میں
خوبیوں کا مجموعہ یا کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ہو جو اس کو دوسروں سے ممتاز کرکے
اس بلند منصب کا اہل بناتی ہو۔ تاکہ وہ قیام جماعت کے لئے جو مآل کار
قیام سلطنت کا ذریعہ ہے، امامت یعنی قیادت کرسکے۔ مگر جب سے مسلمان
لامرکزیت کا شکار ہے، یہ ساری حقیقتیں اسکی نگاہ سے اوجھل ہیں بیچارہ
امام اپنی موجودہ حیثیت اور مرتبے کے لحاظ سے عملاً اہل محلّہ کا اجیر بن کر رہ
گیا ہے۔ جو صرف اس لئے مسجد میں بیٹھا ہے کہ نیم مُردوں پر لیسین، مکمل مُردوں
پر فاتحہ، قبروں پر دُعا، بیاہ شادی کی دیگوں پر "ختم شریف" پڑھ پڑھ کر
پھونکنے اور اپنی شکم پُری کے لئے محلّے کے امیروں اور رئیسوں کی غلامی
کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہات میں (اور بعض جگہ شہروں میں بھی)
اِلّا ماشاء اللہ ——— اماموں کی حیثیت کمینوں یا اجیروں سے
کچھ زیادہ نہیں رہی اسکی وجہ یہ ہے کہ مقتدی تو مدّت ہوئی ثریّا سے ثری
میں گر چکے تھے خود امام بھی اپنے مقام سے اور خود اپنی نظر میں گر چکا ہے
حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی جرأت اور صداقت کو نافذ کرنے کی
صلاحیت اس میں نہیں رہی۔ آج امام کی کتنی وقعت ہے اور امیر مقتدی

اس سے کیا کیا توقعات رکھتا ہے؟ اس کا اندازہ ایک مثال سے کیجئے جو دور کی نہیں آجکل کی بات ہے۔ ایک بڑے قصبے کی ایک مسجد کے پاس بسنے والے ایک چودھری نے امام کو طلب کرکے حکم دیا کہ مجھے قرآن سے چند آیتیں اس مطلب کی نکال دو کہ معدودی جائیداد میں لڑکیوں کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ تاکہ میں ان کے سہارے اپنی دو بیٹیوں کو حصّہ دینے سے انکار کر سکوں!! امام صاحب نے فرمایا کہ چودھری صاحب! جو قرآن اللہ نے نبی پاکؐ پر نازل کیا ہے اس میں تو لڑکیوں کو حصّہ دینے کی تاکید ہے! میرے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ آپکے حکم کی تعمیل میں آپکے مطلب کی کوئی آیت قرآن سے پیش کر سکوں۔ بس پھر کیا تھا۔ چودھری صاحب کی اجو اپنے محلّے کی مسجد کو اپنے باوا کی جاگیر سمجھتے تھے مولوی صاحب سے ٹھن گئی اور بیچارے مولوی صاحب کو اپنی جان کی سلامتی کے لئے وہاں سے کنارہ ہی کرتے بنی!!! یہ مثال تو ایسی ہے جہاں ایک مقتدی کی طرف سے زیادتی ہوئی مگر ایسی بھی بے شمار مثالیں ہیں جہاں محترم اماموں نے محض اپنی شکم پروری کی خاطر شریعت کو بازیچہ اطفال بنا کر اپنے "پالنہاروں" کو خوش کرنے کی سعی کی ہے۔

۴۴ مساجد کی تنظیم کے لئے ائمہ مساجد کا معیاری ہونا ضروری ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ اماموں میں تو اکثریت ان لوگوں کی ہے جو کسی لحاظ سے بھی اس منصب کے اہل نہیں۔ وہ امام اور خطیب کہاں سے آئیں جو علم و فضل۔ سیرت و کردار اور قلب و نظر کے لحاظ سے مساجد اور مساجد کے ذریعہ مسلمانوں کی تنظیم اور احیا کے اہل ہوں؟ اس مقصد کے حصول کے لئے آئمہ مساجد کی تربیت ضروری ہے۔ تعمیر ملت کی بڑی سے بڑی سعی اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک مسجدوں کے منبر و محراب کی زینت ایسے خطیب و امام نہ ہوں جنکی تربیت نصب العین ملی کی روشنی میں ہوئی ہو۔ غلامی کے دردناک عذاب نے ملت کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو اس ہمہ گیر طور پر پارہ پارہ کیا ہے کہ آج مسلمان کا "دین" اور اسکی "دنیا" دو الگ الگ شعبے بن کر رہ گئے ہیں۔ اس تقسیم در تقسیم اور تفریق در تفریق کے عمل نے زندگی کی دو حقیر سے حقیر جزئیات کو بھی آپس میں مربوط نہیں رہنے دیا۔ ورنہ ہماری سیاسی جماعتیں شرعی نظام کی موت اور اس سے پیدا ہونے والی ذلتوں کا انسداد کرتیں!

۴۵۔ سیاسی ترقی دینی احیا کے بغیر بے معنی اور زود میر ہے

آج مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی جماعتیں اپنے گرد و پیش غیر تربیت یافتہ۔ غیر منظم۔ نیم دل۔ نیم جان اور نیم یقین قسم لوگوں کی بھیڑ اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر دیکھ دیکھ کر خوش ہیں کہ انکی واحد نمائندگی۔ ان کی ہمہ گیری اور ان کی قوت کا لوہا مسلّم ہو رہا ہے۔ ان جماعتوں کے پیچھے لگنے والے اور چلنے والے عوام مطمئن ہیں کہ ان میں زندگی اور بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور وہ اپنے نصب العین کی طرف برق رفتاری کے ساتھ بڑھے جا رہے ہیں۔ مگر ان لیڈروں۔ ان لیڈروں کی بنائی ہوئی جماعتوں اور جماعتوں کے افراد کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جب تک مسلمان کا مذہبی اور دینی احیاء نہیں ہوتا انہیں اپنے گرد و پیش کامیابی اور قوت کی صورت میں جو کچھ نظر آ رہا ہے سب سراب ہے۔ سب دھوکا ہے۔ سب خود فریبی اور خدا فریبی ہے۔ مسلم عوام میں زندگی کی تند و تیز اور ابد الآباد تک جاری رہنے والی لہر دوڑانے کا ایک اور صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ مساجد کی تنظیم ہے، جس کو وجود میں لانے کے لئے مساجد کو سنبھالنے والے اماموں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ یہ کام افراد کے کرنے کا نہیں بلکہ ان بڑی سیاسی جماعتوں کے کرنے کا ہے جو عوام کی واحد نمائندگی کے دعوے کے

ساتھ ساتھ خلوص دل سے اس بات کا تہیہ کر چکی ہیں کہ ملت کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔

یہ مقصد یوں حاصل ہو سکتا ہے کہ تمام دینی و سیاسی جماعتیں مل کر اور اگر رقابت و حسد۔ بر خود غلطی اور تفریق و انتشار کی لذت سب کو اسکی توفیق نہ دے تو وہ جماعت جو آج مسلمانوں کے سواد اعظم کی نمائندہ ہے اس مقصد کے لئے موزوں اور مناسب لوگوں کی ایک مختصر سی کمیٹی مقرر کرے جو پیش نظر مقصد کے لئے تمام اسلامی ہندوستان خصوصاً دینی اور دوسری قسم کی درسگاہوں کا معائنہ کر کے حالات کا جائزہ لے اور رپورٹ پیش کرے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مساجد کی تنظیم کے لئے حالات کی سازگاری کا کیا رنگ ہے۔ اسکے بعد رپورٹ سے معلوم شدہ حالات کے پیش نظر ملک کے مقتدر علمائے کرام اور زعما کو علی الاعلان اس امر کی دعوت دی جائے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور تنظیم مساجد اور تربیت آئمہ کے لئے مذہبی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشرتی اور معاشی حالات کو سامنے رکھ کر ایک سہل اور قابل عمل نصاب تعلیم تجویز کریں۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی یہ ہونی چاہیئے کہ جتنے جدید اور قدیم ادارے ہیں ان کی اکیڈمک کونسلوں سے یہ بات منوائی جائے کہ کوئی مسلمان طالب علم اس وقت تک کامیاب تصور نہ کیا جائے۔ اور اس وقت تک اس کو سند کامیابی عطا نہ ہو جب تک وہ اس خاص نصاب میں کامیاب نہ ہو چکا ہو۔

یہاں پر بعض اصحاب یہ اعتراض کریں گے۔ کہ ہر طالب علم کو مُلّا بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ چند دینی مدارس مثلاً دیوبند۔ مظاہر العلوم قاسم العلوم وغیرہ موجود ہیں جو پہلے ہی ایک معقول تعداد میں کٹر قسم کے ملنٹے اور قل اعوذیئے پیدا کر رہے ہیں۔ درست! لیکن ان کے خشک ملنٹے اور قل اعوذیئے ہونے کی وجہ ہی یہ ہے کہ جس ماحول میں ان کی تربیت ہو رہی ہے وہ اس دنیا اور اس دنیا کے ایمان آزما ہنگاموں سے اتنا ہی دور ہے جتنی کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فضا صحیح و صالح دینی تربیت سے دور ہے۔ جب تک دینی اداروں میں جدید قسم کی تعلیم اور انگریزی طرز کے اداروں میں دینی اور قرآنی تعلیم کو ہمہ گیر طور پر رواج نہیں دیا جائے گا تعلیمی خرابیاں دور نہ ہو سکیں گی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ڈگری کے امتحانوں کا ایک مضمون "امامت و خطابت" ہو تو کامیاب طالب علم اپنی معاش کے لئے ضرور کسی مسجد کا حجرہ ہی تلاش کرے۔ بلکہ یہ تجویز تو ہے ہی اس لئے کہ صرف روٹی کی خاطر جو نیم مُلّا قسم کی مخلوق مسجدوں پر قابض ہے اس سے مسجدوں کو نجات دلائی جائے۔ اور ان کی جگہ ایسے لوگ منصب امامت و خطابت پر فائز ہوں جو اپنی ضروریات کے لئے آزادانہ ذریعہ معاش پر بھروسہ کر کے بلا خوف لومۃ لائم مسجدوں کے ذریعے محلّوں شہروں اور عوام کی تنظیم کر سکیں۔ جب تک اس ڈھب کی تنظیم نہ ہو گی تمام سیاسی تنظیمیں ناکارہ ہیں اور ان تنظیموں کے تمام چھوٹے بڑے مقاصد تشنۂ تکمیل رہیں گے حقیقت میں یہی طریق کار ہے جو ایک طرف عوام میں صحیح قسم کی دینی وسعت

بیداری پیدا کریگا اور دوسری طرف کالجوں اور مکتبوں میں پروان چڑھنے والے نونہالوں کے زاویہ ہائے نگاہ و جبلت کو صحیح کر کے ملت کی یک جہتی۔ یکسوئی اور یک جہتی کا سامان پیدا کرنے کا موجب بنیگا۔

جب اس طور پر تربیت پاکر یہ نوجوان تعلیمی اداروں سے نکلیں گے تو دینی و دنیوی زندگی کے تمام اداروں کو اسلامی نقطہ نظر سے چلانے کے اہل ہوں گے۔ اس وقت ہماری مسجدوں۔ انجمنوں۔ اخباروں۔ اور دیگر زندگی کے سرچشموں کی فیض رسانی ہر لحاظ سے بہتر اور تسلی بخش ہو گی۔ نظر بظاہر یہ معروضات "خواب و خیال" کی باتیں معلوم ہوں گی لیکن جب تک حقائق کا سامنا کر کے اصلاح احوال کی سرتوڑ کوشش نہ شروع کی گئی تقدیر کا بدلنا محال ہے۔ اُمّت مرحوم کی زندگی میں وہ فضا پیدا کرنے کے لئے جس میں اطاعت امیر کا جذبہ پرورش پا سکے اور مرکزیت پیدا ہو کر سارے طوفانوں کا مقابلہ ہو سکے اور کوئی طریق کار نہیں ہے